اپنے ہاتھوں میں تھاما ہُوا
میزان

(افسانے)

ڈاکٹر بانو سرتاج

اپنے ہاتھوں میں تھاما ہُوا
میزان

(افسانے)

ڈاکٹر بانو سرتاج

ناشر
نرالی دُنیا پبلیکیشنز
A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
موبائل:0-9811270387

APNE HATHON MEIN THAMA HUA MIZAN

(Short Stores)

by

Dr. Bano Sartaj

2009

Rs. 250/-

نام کتاب	:	اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان
مصنفہ	:	ڈاکٹر بانو سرتاج
سن اشاعت	:	۲۰۰۹ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	دوسو پچاس روپے
کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق	:	انعم آرٹس، دہلی
مطبع	:	ایم۔آر۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-۲

زیرِ اہتمام

تنویر احمد

ملنے کے پتے :

- نرالی دُنیا پبلی کیشنز، A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
- ڈاکٹر بانو سرتاج، سرتاج ہاؤس، بالمقابل آکاشوانی، سول لائنز، چندر پور-442401 (مہاراشٹر)

اُن حقیقتوں کے نام!

جو افسانوں میں ڈھل کر

قابلِ برداشت ہو جاتی ہیں۔

فہرست

پھینکی ہوئی عورت

بیٹے بہو نے چُپکے چُپکے تمام تیاریاں کر لی تھیں۔ ریلوے ریزرویشن، ہوٹل بُکنگ وغیرہ۔ بچوّں کو اُس وقت علم ہوا جب گرم کپڑے نکالے اور سوٹ کیس تیار کیے جانے لگے۔

گڈو، دادی سے زیادہ قریب تھا، دوڑا اُن کے پاس۔ خوشی چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

''دادی...دادی، کلّومنالی کا پروگرام بن گیا۔ پرسوں جانا ہے۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' اماں نے کہا ''کون کون جا رہا ہے؟''

''سب جائیں گے...کتنا مزا آئے گا دادی!''

''سب کون؟'' اماں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''سب یعنی ممّی، ڈیڈی، چھوٹو...میں...''

''اور میں؟'' اماں نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

گڈو چکرا گیا۔ بولا ''میں ممّی سے پوچھ کر آتا ہوں۔'' وہ کمرے سے باہر نکلا تو اماں بھی پیچھے ہو لیں۔

''تم سے کس نے کہا تھا کہ جا کر دادی سے جڑ دو۔'' بہو نے گڈو کو دو طمانچے لگائے۔ پھر ساس کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولی ''سب کیسے جا سکتے ہیں؟''

رُہانسے ہو آئے گڈو کو قریب کھینچ کر اس کا سر سہلاتے ہوئے اماں نے بند ہونٹوں سے کہا ''میں نے کب شکایت کی؟''

شوہر بیوی کی حمایت میں دوڑا آیا۔ سُنانا اماں کو تھا، مخاطب بیٹے سے ہوا ''شدید برف باری ہوئی ہے وہاں۔ سخت سردی پڑ رہی ہے۔ اماں سے سردی برداشت نہ ہوگی۔''

''گھر بھی تو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' بہو نے اپنے فطری زہریلے لہجے میں کہا۔
'پہاڑی مقامات میں رِکشے تانگے نہیں چلتے۔ برف میں پیدل چلنا پڑتا ہے تو پہاڑوں پر گھوڑوں کی سواری کرنی پڑتی ہے۔''
''دادی پہاڑ نہیں چڑھیں گی، برف پر بھی نہیں چلیں گی۔ انھیں ایک جگہ بٹھا دیا کریں گے۔'' گڈو نے تجویز رکھی۔
''بیٹھنا ہی ہے تو گھر ہی میں کیوں نہ بیٹھیں؟ کیوں اماں؟ ٹھیک ہے نا؟'' بہو بولی۔
''تم غلط کب کہتی ہو! مگر میں اکیلی...'' اماں کے لب کپکپائے جملہ ادھورا رہ گیا۔ باقی باتیں آنکھوں نے کہہ دیں۔
''چپراسی صبح شام آکر پوچھ جایا کرے گا۔'' بہو نے حل پیش کیا۔ ''میں نے ملازمہ کو بھی چھٹی دے دی ہے اماں۔ آپ اس پر کہاں تک نظر رکھتیں؟ آٹے نن سے آٹا اور تیل میں سے تیل ایسے پار کر لے گی کہ آپ کو خبر بھی نہ ہوگی۔''
بیٹا جلدی سے بولا۔ ''دراصل وہ بہت دِنوں سے اپنے گاؤں جانا چاہ رہی تھی...''
بہو نے گرم کپڑوں کی تہہ کرتے ہوئے کہا ''آپ کھاتی ہی کتنا ہیں؟ صبح شام تازہ کھانا بنالیا کریں۔ صاف صفائی چپراسی کر دیا کرے گا۔ ہمارے کمرے تو بند ہی رہیں گے۔ اور ہاں'' وہ ذرا رُک کر بولی ''تلی بھنی چیزیں بنا کر نہ کھایئے گا۔''
بیٹا بات برابر کرنے کو پھر بولا ''آپ کا ہاضمہ خراب رہتا ہے نا۔ وہی بنایئے کھایئے گا جو آپ کو سوٹ کرے۔''
''ایسا کرتے ہیں ڈارلنگ۔ فریج لاک کر دیتے ہیں۔ فریج کُھلا رہا تو اماں برف کا پانی پئے بغیر نہیں رہیں گی۔'' بہو نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''مگر میں تمام دن...'' اماں کہتے کہتے رُک گئیں۔
''تمام دن ٹی وی دیکھنا۔'' بہو نے بات پکڑ لی۔ ''ایک سے ایک پروگرام آتے ہیں۔''
''مگر ممی آپ نے تو کیبل والے کو مہینہ بھر کے لیے کنکشن کاٹ دینے کی ہدایت کی ہے۔'' اس مرتبہ چھوٹو بے ساختہ بول اُٹھا۔
''دُوردرشن پر پروگرام نہیں آتے؟ اماں صرف دُوردرشن دیکھیں گی۔'' بہو نے چھوٹو کو کھا

جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''دوسرے چینل پر جو بیہودگیاں دِکھائی جاتی ہیں وہ دیکھنے لائق ہوتیں بھی نہیں۔''

''ممی، آپ تو دن بھر دیکھتی ہیں۔'' چھوٹے نے پلٹ کر جواب دیا۔

بہو ایک لمحے کو رُکی پھر پھٹاک سے بولی ''اماں کی عمر ہوگئی ہے...ویسے بھی وہ تمام دن ٹی وی میں منہ گھُسا کر تھوڑے ہی بیٹھیں گی...عبادت بھی تو کریں گی۔''

بیٹے نے خوامخواہ اُداس چہرہ بنا کر کہا۔ ''کیا کریں؟ رشتہ داروں میں کوئی ایسا ہے نہیں جسے لاکر اماں کے پاس رکھ دیا جائے۔ اماں نے دل میں کہا ''نہ کوئی ایسا ہے جہاں لے جاکر ماں کو پٹک دیا جائے۔''

''وہ تو ہے مگر...'' بہو اپنی بات پر اَڑی رہی ''گھر خالی کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ چور اُچکے تاک میں رہتے ہیں۔ گھر بند دیکھیں گے تو ہاتھ صاف کر جائیں گے۔''

''مگر، اگر چور گھُس ہی آئے تو دادی بھلا کیا کرلیں گی!'' گڈّو نے طفلانہ معصومیت سے کہا۔

''تمھارا ہر بات میں بولنا ضروری ہے کیا؟'' بہو نے دانت پیسے۔

''بڑوں کی گفتگو میں بچّوں کو دخل نہیں دینا چاہیے۔'' شوہر نے بیوی کا پارہ کم کرنے کی غرض سے کہا۔

''ہاں اماں...'' شوہر کی حمایت سے شیر ہوکر بہو بولی ''پاس پڑوس میں جا کر گھنٹوں نہ بیٹھیے گا...نہ کسی کو گھر میں بلایئے گا۔''

''باتیں کرنے کو دِل چاہے تو...؟'' اماں نے خاموش نظروں سے سوال کیا۔

بہو سوال سمجھ کر بولی۔ ''کبھی دِل نہ لگے تو گیٹ پر کھڑے ہوکر باتیں کرلیا کیجیے...مگر آدمی دیکھ کر شریف لوگوں سے، سبزی والے، خوانچے والے، دہی والی سے نہیں۔''

رات کی ٹرین سے جانا تھا سب کو۔ اسٹیشن جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہوئے تو بیٹے نے کہا ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں اماں، میں نے چوکیدار سے کہہ دیا ہے۔ رات کو تین چار مرتبہ گیٹ تک آکر دیکھے گا۔''

بہو چلاّئی...''گھر کا خیال رکھنا۔''

گڈّو نے نم آنکھوں سے پوچھا ''دادی آپ کے لیے وہاں سے کیا لائیں؟''

''بس تم سب واپس آ جاؤ... خیریت سے واپس آ جاؤ۔'' اماں نے بھرے گلے سے کہا مگر ٹیکسی تب تک جا چکی تھی۔

بتیاں بجھا کر اماں اپنے کمرے میں آگئیں۔ بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہیں۔ سوچتی رہیں کہ پہاڑ سے دِن اور قیامت سی راتیں کیسے کاٹیں گی۔ اُسی وقت لائٹ چلی گئی۔ گرمی سے پریشان ہو کر انھوں نے تپائی پر رکھا اخبار اٹھالیا اور جھلنے لگیں... اخبار! ان کے ذہن میں اچانک خیال آیا... ہاں وہ اخبار پڑھ کر وقت کاٹ لیں گی۔ گھر میں تین تین اخبار آتے ہیں۔ انھیں اخبار پڑھنے کا بڑا شوق ہے... مگر کوئی پڑھنے دیتا ہی نہیں۔ سویرے آفس جانے تک بیٹا چاٹتا رہتا۔ دوپہر کو بہو لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ خود پڑھتی ہو یا نہ پڑھتی ہو، ساس کے ہاتھ نہیں لگنے دیتی۔ بچّوں کے اسکول سے آجانے کے بعد تو پڑھنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا... مگر اب... اب وہ اخبار پڑھنے کی اپنی خواہش ضرور پوری کریں گی۔ ایک ایک کالم ایک ایک حرف پڑھ جائیں گی۔

اس فیصلے کے بعد وہ مطمئن ہو کر سوگئیں۔

سویرے چائے پی کر وہ برآمدے میں جا بیٹھیں۔ اخبار والے کا انتظار کرنے لگیں۔ سورج نکل آیا۔ دُھوپ تیز ہوگئی مگر وہ نہ آیا۔ وہ بے چین ہوگئیں۔ نو بجے چپراسی آیا تو اماں نے کہا ''چرن داس! دیکھو تو آج اخبار کیوں نہیں آئے؟'' چرن داس خاموش رہا۔

''کل نہ گزیٹیڈ چھٹّی تھی نہ تیوہار تھا۔ پھر کیا ہاکر چھٹّی پر چلا گیا؟'' اپنی دانست میں اماں نے ہلکا سا مذاق کیا۔

''ماں جی، صاحب نے ایک مہینے کے لیے اخبار بند کرادیے ہیں۔ میرے سامنے ہی ہاکر سے کہا تھا کہ ہم لوگ گھومنے جارہے ہیں۔ ایک مہینہ اخبار نہ ڈالنا۔ جب ہم آجائیں گے، فون کردیں گے۔''

اماں کو چکّر آگیا۔ چرن داس انھیں ہمدردی سے دیکھ رہا تھا بولا ''ماں جی... خرید کر لادوں اخبار؟''

''نہیں رہنے دو۔'' کسی طرح خود کو سنبھال کر وہ کھڑی ہوئیں ''پودوں میں پانی ڈال کر تم چلے جاؤ۔''

"کچھ کام ہے ماں جی؟"

"فی الحال تو نہیں۔" کہہ کر وہ مڑ گئیں۔ پھر کسی خیال کے تحت برآمدے سے چھت پر جانے والے زینوں کی طرف بڑھیں۔ وہاں ایک کونے میں ردّی اخبار رکھے جاتے تھے۔ وہ ایک موہوم سی اُمید کے ساتھ آخری سیڑھی تک پہنچ گئیں۔

ردّی اخباروں کا بے ترتیب ڈھیر ان کے سامنے تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئیں۔

ملازمہ کی چھٹّی، فریج بند، اخبار بند، ٹی وی چینل بند، پڑوسیوں سے میل جول پر پہرے کے بعد یہ اخبار کیوں کر رہ گئے؟ کیا اس لیے کہ ردّی ہیں!

خیر! کون سا انھیں زمانے کے ساتھ چلنا ہے جو تازہ اخبار ہی پڑھے جائیں۔ انھوں نے آگے بڑھ کر چند اخبار اٹھا لیے اور آہستہ آہستہ نیچے اُتر آئیں۔ پڑھنا ہی ہے تو پرانے اخبار بھی پڑھے جا سکتے ہیں... کون کہتا ہے ردّی چیزیں کام میں نہیں آتیں — ان کے دل میں ٹیس اُٹھی۔ چار سال قبل اُن کے شوہر کے انتقال کے بعد بہو انھیں اپنے ساتھ لانے پر آمادہ نہیں تھی۔ بیٹے نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے "میں اکیلی اولاد ہوں ان کی۔ کہاں جائیں گی امّاں؟ لوگ کیا کہیں گے؟ لے چلتے ہیں۔ پڑی رہیں گی ایک طرف۔"

دو آنسو ہاتھ میں پکڑے اخبار پر لڑھک آئے۔ انھیں صاف کر کے امّاں نے اخبار کو سہلایا اور بولیں: "ہماری تمھاری قسمت ایک سی ہے بھیّا۔ کام نکل گیا۔ پھینک دیئے گئے۔ آؤ، ہم مل کر ایک دوسرے کا دُکھ بانٹیں۔"

آرام کرسی پر لیٹ کر اُنھوں نے اخبار کھول لیا۔

OO

کیل پر ٹنگا بچپن

سارہ کو قطعی اُمید نہیں تھی کہ داور اُس کے خط کا فوری جواب دیں گے۔ نہ صرف جواب دیں گے بلکہ اس کے مشن میں دلچسپی بھی لیں گے۔ کئی مرتبہ ان کا خط پڑھ چکی تھی۔ خط کا ایک ایک لفظ اسے یاد ہو گیا تھا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خط اسی شخص نے لکھا ہے جسے خاندان میں مغرور، بد دماغ، خود پسند کہا سمجھا جاتا ہے۔ داور نے لکھا تھا:

"بیگم سارہ احمد جیلانی!

آپ کا خط ملا۔ حویلی پشتینی ہے۔ اس پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا۔ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے جو آپ نے یہاں آ کر رہنے اور اسکول کھولنے کی اجازت ہم سے طلب کی ہے۔ ہم آپ کے اس ارادے کو سلام کرتے ہیں۔ در حقیقت اس گاؤں میں ایک ایسے مثالی مدرسے کی سخت ضرورت ہے جہاں دینی اور دنیوی تعلیم کا مناسب انتظام ہو۔ حویلی کے سات کمرے ہمارے استعمال میں ہیں۔ آٹھ کمرے آپ اسکول کے لیے لے سکتی ہیں۔

خان داور زماں"

"خالہ بی..." سارہ نے خط پڑھ کر سناتے ہوئے کہا۔ "آخر یہ داور صاحب کرتے کیا ہیں؟"

"اے نوج... اسے کچھ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ خاندانی دولت اس کی سات پشتوں کے لیے کافی ہے۔"

سارہ کو سخت حیرت ہوئی۔ گویا اس زمانے میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو موروثی دولت پر تکیہ کرتے "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مصداق زندگی بسر کرتے ہیں۔

"وہاں کون کون ہے خالہ بی؟"

"داور کے والدین یعنی تمھارے چچا چچی حیات نہیں ہیں۔ داور کی بڑی بہن لڑکپن میں انتقال کر گئی۔ چھوٹی بہن پہلے بچّے کی پیدائش میں چل بسی۔ ان پے در پے صدموں نے داور میاں کو دنیا سے بیزار کر دیا۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ کہیں آتے جاتے ہیں نہ تعلقات رکھتے ہیں۔ اب یہی دیکھو، تم نے اپنے خط میں اپنا تعارف دیا تھا۔ اس نے ایک سطر میں بھی تمھاری والدہ اور بھائیوں کی خیریت نہیں دریافت کی، میری بات تو دُور رہی۔"

سارہ کے دادا اور داور کے دادا سگے بھائی تھے۔ برسوں پہلے سارہ کے دادا جان نے شہر میں رہائش اختیار کر لی تھی اور رفتہ رفتہ گاؤں کا رُخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وجہ کوئی خاص نہیں تھی۔ بس داور کے دادا جان اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے جدید طور طریقے والے اپنے بھائی کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ سارہ کی شادی کے بعد پورا خاندان ملک کے باہر جا بسا۔ وہاں والد انتقال کر گئے۔ والدہ دائمی مریضہ بن گئیں۔ اس کے بعد سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ سارہ کے شوہر ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے۔ تینوں بھائی آئے۔ وہ سارہ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر سارہ نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی زندگی اپنی طرح جینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے شوہر کی یادوں کا سہارا کافی تھا۔ سسرال میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے خالہ بی کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان کے ساتھ ان کی ملازمہ مریم آپا بھی آئیں۔ اس طرح سارہ کو دو بزرگ خواتین کا سہارا مل گیا۔

ایک روز خالہ بی کو اچانک ایک خیال آیا۔ بولیں: "تم ہمیشہ کہتی رہتی ہو کہ تمھیں اسکول کھولنا ہے، گاؤں میں اسکول کیوں نہیں کھولتیں؟ احمد پور گاؤں میں تمھارے بھائی ہیں۔ بہت بڑی حویلی ہے اُن کی۔"

سارہ کو تجویز پسند آئی۔ کہنے لگی: "میں انھیں خط لکھتی ہوں۔ اگر انھوں نے اعتراض نہ کیا تو صرف مَیں ہی نہیں، آپ بھی میرے ساتھ وہاں چل کر رہیں گی۔"

"نہیں! یہ مناسب نہ ہوگا۔" خالہ بی جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ "ہمارے پہنچنے سے کہیں داور کوئی غلط مطلب نہ اخذ کرے۔ تم اسکول کھولنے کے مقصد سے وہاں پہنچو۔ حالات سازگار ہو جائیں تو مجھے بلا لینا۔ ہاں۔ مریم کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

سارہ، مریم آپا کے ہمراہ احمد پور پہنچ گئی۔ داور نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ دو روز تک انھیں مہمان رکھا۔ حویلی میں داور کے علاوہ دوسری شخصیت کریم بھائی کی تھی۔ وہ داور

کے نجی ملازم بھی تھے، خانساماں بھی، چوکیدار بھی تھے اور ڈرائیور بھی۔

داور متین اور کم گو تھے۔ نرم خو، نرم مزاج۔ دورانِ گفتگو انھوں نے سارہ کے حالات سے آگاہی حاصل کر لی اور اسے ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا۔

تیسرے روز سارہ نے اس کے لیے تیار کیے گئے کمروں میں رہائش اختیار کر لی۔ داور اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ سحر خیز تھے۔ سویرے کی سیر کے بعد غسل کرتے، پھر ناشتہ کر کے زمینوں کے معائنے کو نکل جاتے۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرتے اور پھر بقیہ وقت لائبریری میں گزارتے۔

اگلے چند دِنوں میں سارہ نے اسکول کا مکمل پلان تیار کر کے داور کے سامنے رکھ دیا۔ بچّے پروانوں کی طرح کھنچ کر آنے لگے تھے۔ لڑکیوں کو دست کاری سکھانے کا انتظام اس نے مریم آپا کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے مدِ نظر کیا تھا۔ پہلے سے یہ اس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

داور نے پلان بے حد پسند کیا۔ جھجکتے ہوئے بولے: ''بیگم سارہ احمد جیلانی! جب ہمیں آپ کا خط ملا تو ہم نے کسی سخت گیر استانی کا تصوّر کیا تھا۔ مگر آپ اس تصویر سے یکسر مختلف نکلیں۔''

''سخت گیر استانی آپ کسے کہتے ہیں۔'' سارہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

''بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے مارنے والی، ذرا ذرا سی بات پر سختی سے پیش آنے والی استانیاں ہمیں پسند نہیں۔''

''آپ کے سوچنے کا انداز غلط ہے داور زماں صاحب۔ ہر عورت بنیادی طور پر ماں ہے۔ ممتا کی مورت، پیار کا ساگر۔ کیا ماں اپنی اولاد کو نہیں مارتی؟ اسے سزا نہیں دیتی؟ مارتی بھی ہے سزا بھی دیتی ہے مگر اس کی بہتری کے لیے۔ طوفانی لہروں کو قابو میں کرنے کے لیے کیا باندھ نہیں باندھا جاتا؟ بچّوں کی مناسب نشو ونما اور پرورش و پرداخت کے لیے استاد کو ان سے سختی سے بھی پیش آنا پڑتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ استاد اور سخت گیری کو باہم جوڑ دیا جائے۔'' سارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم آپ کی دلیل کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہم غلطی پر تھے۔'' وہ زیرِ لب مسکرائے۔

سارہ بھی مسکرا دی۔ بولی: ''میں نے بھی آپ کے متعلق ایک خاکہ ذہن میں بنایا تھا۔''

''اچھا — گویا کہ آپ نے یہاں آنے سے قبل ہمارے بارے میں کچھ سوچا تھا —؟''

''یقینی بات ہے۔ ہم بہت دنوں بعد بلکہ پہلی بار مل رہے تھے جبکہ ہماری زمین ایک ہی تھی۔ ہمارا سوچنا بالکل فطری تھا کہ مقابل کیسا ہوگا؟ کس طرح پیش آئے گا۔''

''اچھا! تو کیا خاکہ تھا ہمارا آپ کے ذہن میں؟'' وہ کچھ بے چینی سے بولے۔

''یہی کہ آپ آدم بیزار ہیں۔ تصوّر میں ایک گھنی مونچھوں والا بارُعب شخص، کلف لگے کپڑوں میں، آنکھوں پر سنہری کمانی کا موٹے شیشوں والا چشمہ لگائے، چھڑی ہاتھ میں تھامے، کارندوں پر گرجتا برستا نظر آتا تھا۔ مگر نہ آپ کی آنکھوں پر چشمہ ہے نہ ہاتھ میں چھڑی، آپ کا لہجہ بھی نرم ہے اور آپ عام جاگیرداروں کی طرح غصہ ور اور ظالم بھی نہیں ہیں۔''

''اور وہ پہلا والا الزام—'' داور شرمندگی سے بولے۔

''وہ قائم ہے۔ آپ تنہائی پسند ہیں اس سے آپ انکار نہیں کرسکتے۔ آپ نے رشتہ داروں سے تعلق نہیں رکھا۔ آپ کے احباب کا کوئی حلقہ نہیں ہے۔ گاؤں والوں سے آپ ضرورت کے تحت بات کرتے ہیں۔ نہ ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں نہ غمی میں پھر آدم بیزار اور کسے کہتے ہیں؟''

داور نے پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ خاموش ہوگئے تھے۔

سارہ کا اسکول چل نکلا۔ محکمۂ تعلیم سے ضروری خط و کتابت چل رہی تھی مگر جہاں امید افزا نتائج سامنے تھے وہاں معاشی مسئلے سارہ کو پریشان کررہے تھے۔ وہ انھیں حل کرنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ رہی تھی کہ ایک روز داور نے سارہ کو شام کی چائے پر مدعو کیا۔ گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے بولے:

''بیگم سارہ احمد جیلانی، آپ کی لگن اور محنت قابلِ تعریف ہے۔ ہمیں آپ پر رشک آنے لگا ہے۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو کہیے؟''

''کیا آپ سنجیدہ ہیں؟''

''یقیناً— نیک کام میں کون شریک نہ ہونا چاہے گا؟''

''تو ایسا کرتے ہیں۔ اسکول کا نام تایا جان یعنی آپ کے والد صاحب کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔'' سارہ نے تجویز پیش کی۔

''اس سے کیا ہوگا—؟''

''اس سے یہ ہوگا کہ اسکول آپ کی ملکیت ہو جائے گا اور میں تنخواہ دار ملازم بن جاؤں گی۔''

''آپ کیا فرما رہی ہیں؟ ہماری سمجھ میں نہیں آیا؟'' وہ کچھ اُلجھے ہوئے بولے۔

''داور زماں صاحب، اسکول کے ساز و سامان خریدنے میں میں کافی رقم صرف کر چکی ہوں۔ فی الحال ایک اور استانی کا تقرر کرنا ہے۔ مریم آپا سلائی سکھاتی ہیں۔ ان کا مشاہرہ مقرر کرنا ہوگا۔ مسجد کے مولانا صاحب دینی تعلیم کی کلاس لیتے ہیں انھیں تنخواہ دینی ہے۔ مجھے بھی ضرورت ہے۔ جب تک گرانٹ نہیں ملتی میں چاہتی ہوں یہ ذمہ داری آپ قبول کریں۔''

داور بخوشی راضی ہو گئے۔ سارہ کچھ اُداس ہو گئی۔ دل میں سوچ رہی تھی کس قدر غیر جذباتی ہے یہ شخص! جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ اوروں کی بات جانے دیجیے، آپ ہماری بہن ہیں، ہم آپ کی تنخواہ مقرر کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمارا سب کچھ آپ کا ہے، جو ہو۔ اس نے سر کو جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ ایک بڑا مسئلہ انھوں نے حل کر دیا تھا یہی کافی تھا۔

بعض اوقات داور سے کئی کئی دن سارہ کی ملاقات نہ ہوتی۔ جب ضرورت ہوتی انھیں ڈھونڈ کر ان کے پاس پہنچنا پڑتا۔ وہ اپنی کتابوں میں گم رہتے جیسے ان کتابوں کے علاوہ دُنیا میں کچھ نہ ہو۔ ایک روز سارہ نے انھیں لائبریری میں جا گھیرا۔

''جناب داور زماں صاحب، حویلی کے پچھلے حصّے میں جو چار کمرے ہیں کیا وہ اسکول کو عنایت کیے جا سکتے ہیں؟ دراصل میں ایک کلاس بڑھانا چاہتی ہوں۔ قریبی گاؤں کے نمائندے میرے پاس آئے ہیں۔ وہ اپنے بچّوں کو ہمارے اسکول میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں اسکول کو آہستہ آہستہ رہائشی اسکول میں تبدیل کرنا چاہتی ہوں۔ ایک کمرے میں فی الحال اُن چند بچّوں کو رکھوں گی جو دُور دراز کے مقامات کے ہیں۔''

''اچھا خیال ہے۔'' داور شاذ ہی اس کی کسی تجویز پر نااتفاقی ظاہر کرتے تھے۔ ''مگر تین کمرے ہی مل سکیں گے چوتھا کمرہ خالی نہیں ہے۔ اس میں ہماری یادگار چیزیں ہیں۔''

''عجائب خانہ؟'' سارہ نے تجسّس سے پوچھا۔ زمینداروں، جاگیرداروں کی سنک کے ڈھیروں قصّے اس نے سُن رکھے تھے۔ خود زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ ایسی باتوں سے دُور رہی کیونکہ اس کے دادا جان اور والد دونوں میں جاگیردارانہ ذہنیت کے جراثیم نہیں تھے۔

''عجائب خانہ تو نہیں ہے۔ ہاں کچھ ایسی چیزیں ہیں جن سے ہماری ذہنی اور جذباتی وابستگی ہے۔خزانہ کہہ لیجیے ہمارا۔'' وہ بولے۔

''مجھے نہیں دِکھلائیں گے؟'' سارہ نے اصرار کیا۔ چند لمحوں تک داور تذبذب میں مبتلا رہے۔ پھر میز کی دراز سے چابیوں کا گچھا نکال کر بولے:

''تشریف لائیے...''

سارہ سوچ رہی تھی، کیا کیا ہوگا اس ذخیرے میں؟ اسلحے، آرٹ کے نادر نمونے، چینی کے ظروف، جھاڑ فانوس یا...

کمرے میں قدم رکھتے ہی ششدر رہ گئی۔ وہ کمرہ کسی بالغ انسان کا نہیں، کسی بچّے کا کمرہ جان پڑتا تھا۔ دیواروں پر ایک سے ایک عمدہ اور قیمتی کھلونے ٹنگے ہوئے تھے۔ کھلونا بندوقیں، غلیل، کرکٹ اور بیڈمنٹن کے بلّے، ماؤتھ آرگن، موٹریں، ہوائی جہاز، چھوٹی بڑی دو سائیکلیں اور اسی طرح کا سامان سلیقے سے سجا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے داور زماں صاحب؟'' وہ حیرت سے انھیں تکتی ہوئی بولی۔

''ہمارا بچپن...اور کیا...؟''

''میں سمجھی نہیں...'' سارہ نے پلکیں جھپکائیں۔

''سمجھنا کیا ہے بیگم سارہ... ہمارے والد ڈسپلن کے پابند، نہایت سخت گیر انسان تھے۔ انھوں نے عام بچّوں کی طرح ہمیں کبھی کھلونوں سے کھیلنے نہیں دیا۔ یہ تمام کھلونے جو آپ دیکھ رہی ہیں سب ہمارے ہی لیے خریدے گئے تھے۔ ہماری سالگرہ اور دوسرے مواقع پر ہمیں تحفتاً ملے تھے۔ کھیلنا تو دُور، ہم انھیں جی بھر کر دیکھ بھی نہیں پاتے تھے کہ بابا جان اسے دیوان خانے کی دیوار پر آویزاں کر دیتے، یہ کہہ کر کہ استعمال کرنے سے خراب ہو جائیں گے۔ آج ہمیں ان کھلونوں سے کھیلنے سے روکنے والا کوئی نہیں ہے مگر ہم ان سے کھیل نہیں سکتے — کیوں؟ کھیل سکتے ہیں کیا؟ کہیے سارہ احمد؟''

سارہ کو داور پر بڑا ترس آیا۔ وہ اسے کسی معصوم بچّے کی طرح لگے۔ اس کا جی چاہا پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرے اور کہے کہ 'اٹھاؤ اس بچّے کو، جو تم میں کہیں چھپا بیٹھا ہے، اور آزاد کر دو۔ ان کھلونوں کو اس کے حوالے کر دو تاکہ وہ کھیل کر انھیں توڑ ڈالے اور تم ان کی جذباتی

قید سے آزاد ہو جاؤ۔ تمھارا ذہن ان کھلونوں کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالے اور تم زندگی کے اگلے پڑاؤ میں داخل ہو جاؤ، چلو۔ یہ نہ کہہ سکے تو کم از کم یہ کہہ دے کہ آپ تو ساری دنیا کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ کیا آپ نے کہیں نہیں پڑھا کہ جن بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا جاتا ہے وہ کبھی نارمل زندگی گزار نہیں پاتے۔ بچپن ہی کیوں؟ جن پر جوانی میں بزرگوں کی سی ذمہ داریاں ڈال دی جاتی ہیں وہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں'۔

''بیگم سارہ! چلیں اب؟'' داور اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس کے باہر نکلنے کے منتظر تھے۔ سارہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

اس واقعے کے بعد کئی مرتبہ اس نے داور کو اس کمرے میں جاتے اور گھنٹوں وقت گزارتے دیکھا۔ پہلے بھی دیکھا ہوگا مگر توجہ نہیں دی تھی۔

اس روز داور اس کے یہاں مدعو تھے۔ مریم آپا نے بہترین کھانے بنائے تھے۔ کھانے کے بعد دونوں باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''جناب داور زماں صاحب...'' اس نے کہا ہی تھا کہ وہ ٹوک کر بولے: ''یہ کیا اتنا لمبا چوڑا نام لیتی ہیں۔''

''بیگم سارہ احمد جیلانی سے زیادہ لمبا تو نہیں ہے۔'' سارہ نے برجستہ کہا۔

وہ خجل ہو کر بولے: ''آپ خاتون ہیں۔ خواتین سے تخاطب مہذب ہونا چاہیے۔''

سارہ نے ترکی بہ ترکی کہا: ''آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ بڑوں کو عزت و تکریم سے مخاطب کرتے ہیں۔''

''ہم آپ سے نہیں جیت سکتے۔'' کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

''سوال جیت ہار کا نہیں ہے۔ میں نے زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کی دُنیا لائبریری اور آپ کے خزانے تک محدود ہے۔ میں نے رشتوں کی وسیع دنیا میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی ہے۔ بزرگوں سے، ہم عمروں سے، بچّوں سے کیسے تعلقات رکھے جاتے ہیں یہ میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ جنھیں ہم پسند کرتے ہیں ان کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور جنھیں ہم پسند نہیں کرتے اُن سے کیسے نبھایا جاتا ہے یہ آرٹ بھی مجھے آتا ہے... دراصل یہ سب جاننا ہی زندگی کو صحیح طریقے سے جینا ہے۔ لائبریریوں میں، الماریوں، میز کرسیوں،

کتابوں اور بند کمرے میں پرانے کھلونوں سے باتیں کرنے والا شخص ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔''

''بیگم سارہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

سارہ گڑ بڑا کر بولی: ''کتنے سالوں سے مطالعہ کر رہے ہیں آپ؟ موضوع کیا ہیں آپ کے...؟''

''ادب اور فلسفہ۔ آٹھ سالوں سے کتابیں ہماری رفیق ہیں، جب سے بابا جان ہمیں چھوڑ کر گئے۔''

''آٹھ لوگوں کو بھی کبھی فائدہ پہنچایا ہے آپ نے؟ سارہ تلخی سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' داور کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے کوئی چیز ایجاد کی ہوتی، کوئی شاہکار لکھا ہوتا، کسی کی آنکھوں سے آنسو پونچھے ہوتے، کسی کے لبوں پر مسکراہٹ سجائی ہوتی تو کوئی بات تھی۔ زندگی ہی کے فلسفے کو کہاں سمجھا آپ نے؟ کتابوں میں ڈوب کر زندگی سے فرار چاہنے والے کیا جانیں کہ گلشن میں بہار کب آتی ہے؟ پھول رنگ اور خوشبو کب بکھیرتے ہیں؟ پرندے اپنے گیتوں سے دلوں میں اُمنگ کب اور کیوں بھرتے ہیں؟''

داور ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہے تھے۔ ''سچ بتایئے! آپ زندگی میں کتنی بار کھل کر ہنسے ہیں؟ میں نے تو آپ کو مسکراتے بھی کم ہی دیکھا ہے۔ مجھے دیکھئے...'' سارہ نے نظریں جھکا لیں۔ ''والدہ اور بھائی پردیس میں ہیں۔ احمد جیلانی کے لیے والدین سے دوری گوارا کی، وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ اولاد کے لیے ترستی رہی مگر وہ بھی خدا نے نہیں دی۔ اتنے دُکھوں کے بعد بھی میں ہنستی ہوں۔''

''آپ نے شادی کیوں نہ کر لی؟ خوشیاں لوٹ آتیں زندگی میں۔''

''گویا آپ مانتے ہیں کہ زندگی میں کسی کو شریک بنانے سے زندگی میں خوشیوں کا گزر ہوتا ہے۔ تو آپ نے کیوں نہیں کی شادی؟'' سارہ نے ڈبڈبائی آنکھوں کو کمال خوبصورتی سے خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

داور نے زخمی نظروں سے سارہ کو دیکھا۔ کئی لمحوں کی خامشی کے بعد بولے: ''کون کراتا

ہماری شادی؟ باباجان نے خود ہمیں کوئی فیصلہ کرنا سکھایا نہیں۔ ہم کیا کریں گے، کیا نہیں کریں گے یہ وہ طے کرتے تھے۔ امّی جان کو بڑا ارمان تھا ہماری شادی کا۔ انھوں نے تو کب سے ہمارے لیے دُلہن کی تلاش شروع کردی تھی مگر باباجان نے مخالفت کی کہ کم عمر میں لڑکے کی شادی کردو تو زن مرید بن جاتا ہے۔ پکّی عمر میں شادی کرنے سے بیوی اسے اپنے اشاروں پر نہیں چلاسکتی۔ امّی جان بھولانے کا ارمان دل میں لیے چل بسیں اور باباجان نے خود کے تنہا ہوجانے کے ڈر سے ہماری شادی نہ ہونے دی۔ ورنہ ہم نے تو ایک لڑکی پسند بھی کرلی تھی۔''

''کون تھی وہ لڑکی؟ کہاں ہے اب وہ؟'' سارہ نے بے اختیار سوال کیا۔

داور نے چونک کر اسے دیکھا۔ سارہ نے نظریں جھکالیں۔ داور نے طویل سانس لے کر کہا ''وہ حیات ہے۔ اپنے شوہر اور بچّوں میں مگن مطمئن ازدواجی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی کی پرسکون جھیل میں پتھر پھینکنے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ چند لمحے رُکے پھر سارہ پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولے: ''کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ بس ایسے ہی جب امّی جان نے ہماری شادی کا ذکر کیا تو ہم سوچتے تھے کہ کوئی ہم سے ہماری پسند پوچھے گا تو ہم اس لڑکی کا نام لے دیں گے۔ مگر پسند پوچھنا تو دُور اس آواز ہی کو دبادیا گیا جس نے شادی کی بات کی تھی۔ امّی کو یہی غم کھا گیا۔''

سارہ نے محسوس کیا، داور اتنے غیر جذباتی اور پتھّر دل نہیں ہیں جتنا ظاہر کرتے ہیں۔ جب بھی ان کی آنکھیں بھرآتیں وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر جھکالیتے۔ یہاں تک کہ آنکھوں کا پانی خشک ہوجاتا۔ اس وقت بھی انھوں نے یہی کیا تو سارہ نے سوچا کیا داور حقیقت میں اتنے ہی معصوم ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ درد آنکھوں ہی سے نہیں آواز سے بھی ٹپکتا ہے۔

''آپ پرانی یادوں کے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کریں۔ ماضی سے جڑے رہنے سے نہ حال سنورتا ہے نہ مستقبل بنتا ہے۔'' کہنے بھر کو سارہ نے تسلّی کے یہ الفاظ ادا کردیے ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ داور کو بڑھ کر اپنی گود میں چھپالے۔ ایک مشفق ماں کی طرح اُن کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہے۔ ''رولو۔ جی بھر کر رولو—— دل کا غبار نکل جانے دو۔ سب بھول جاؤ، صرف ایک بات یاد رکھو کہ ہر ایک کو اپنے حصّے کا سکھ چھین کر لینا پڑتا ہے۔ خوشیوں کا کوئی موسم نہیں

ہوتا۔ مسرّتوں کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے اسی کے مطابق اسے خوشیاں وغم ملتے ہیں۔''

مریم آپا کا خیال کر کے وہ بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش کو لگام لگا پائی تھی۔

مریم آپا اسے ہمیشہ داور سے ایک خاص دوری بنائے رکھنے کی تاکید کرتی رہتی تھیں۔ اخلاقیات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس لیے سارہ اس ہدایت کو سر آنکھوں پر رکھتی تھی۔ داور کے جانے کے بعد مریم آپا نے آ کر اسے سینے سے لگالیا تھا۔ اس کی پیشانی چوم کر بولی تھیں:

''بی بی، آج تم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے محبّتوں کے چراغ جلانا اور اس کے نور سے دلوں کو منوّر کرنا بہت بڑی جیت ہے۔''

داور میں جو نمایاں تبدیلی اس گفتگو کے بعد ہوئی اس سے سب ہی خوش تھے۔ خصوصاً کریم بھائی کی خوشی دیدنی تھی۔ اب داور تقریباً روزانہ اسکول کے کمروں کی طرف آ نکلتے۔ سارہ سے گفتگو کرتے۔ شام کی چائے سارہ ان ہی کے ساتھ پینے لگی۔ دو ملازم رکھ لیے گئے تھے۔ ہوسٹل میں بچّوں کی تعداد گیارہ ہوگئی تھی۔ ان کی رہائش اور طعام کا انتظام ان ملازموں کے ذمّے تھا۔ کہاں تو یہ بچّے جب شام کو آنگن میں کھیلتے تو داور لائبریری کی کھڑکیاں دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ اب وہ اکثر کھڑکی سے ان بچّوں کو کھیلتے دیکھتے کھڑے رہتے۔

ایک روز سارہ نے کہا: ''داور صاحب — آپ زمین جائداد کا حساب دیکھتے ہیں کبھی؟''

اب وہ داور صاحب کہہ کر انھیں مخاطب کرتی تھی۔ وہ بھی مختصراً بیگم سارہ کہنے لگے تھے۔

''نہیں... مختار صاحب بھروسے کے آدمی ہیں۔ باباجان کے وقت سے ملازم ہیں۔'' انھوں نے جواب دیا تھا۔

''پھر بھی... کسی پر بہت زیادہ اعتماد مناسب نہیں ہوتا...''

''کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے پاس بے اندازہ دولت ہے۔'' داور نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''اوہ...! میں بھی وہ ہنڈے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' سارہ نے طنز سے کہا۔

''کون سے ہنڈے؟'' انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

''جن میں آپ کے آباء واجداد کی دولت زمین میں گڑی رکھی ہے۔ قصّے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ آج دیکھ بھی لوں گی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔''

''ہشت!'' داور نا گواری سے بولے۔ ''ہماری دولت بینکوں میں محفوظ ہے۔''

''خوب! دولت بینکوں میں پڑی گھن کھا رہی ہے۔ کیا اس سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ انھیں رفاہی کاموں میں خرچ کریں۔ میری صاف گوئی کو معاف کیجیے گا۔ آپ کے دادا جان اور بابا جان آپ کے لیے دولت کا انبار لگا گئے۔ بقول آپ کے آپ دونوں ہاتھوں سے بھی خرچ کریں تب بھی وہ دولت ختم نہ ہوگی۔ لیکن یہ بتائیے آپ کے بعد اس دولت کا کیا مصرف ہوگا۔''

سارہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دو قدم آگے بڑھی تھی کہ داور نے پکارا: ''بیگم سارہ! پلیز رُک جائیں۔'' سارہ لوٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ داور خاموش بیٹھے رہے۔ لگتا تھا ذہن میں آندھیاں چل رہی ہیں۔ سارہ نے کہا: ''میری بات پر غور کریں۔ نامناسب لگے تو کہہ دیجیے۔ معافی مانگ لوں گی۔''

پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ داور نے کہا:

''خدا کی قسم بیگم سارہ! آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ معافی تو ہمیں مانگنی چاہیے کہ اتنی معمولی سی بات ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ واقعی ہمارے بعد ہماری دولت کا کیا ہوگا؟ ہمیں چاہیے کہ آج چند بچّوں کا مستقبل سنوار دیں۔ بولیے۔ بیگم سارہ ہم آپ کے اسکول اور بچّوں کے لیے کیا کریں؟''

''گاؤں کے اسکول کے ان چند بچّوں سے ہم اپنے مشن کا آغاز کریں۔ ہمارا اسکول ان بچّوں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تکنیکی تعلیم دے۔ جن غریب بچّوں کی رہائش کا ذمہ ہم نے لیا ہے انھیں اچھی خوراک اور بے فکر زندگی عطا کرسکیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔'' سارہ بے حد مسرور تھی۔

''ایسا ہی ہوگا بیگم سارہ، ایسا ہی ہوگا۔'' داور نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ سارہ تقریباً دوڑتی ہوئی مریم آپا کے پاس پہنچ کر بولی:

''آج بھی میں جیت گئی مریم آپا۔ آج میں نے داور صاحب کو دولت کے صحیح مصرف کے لیے آمادہ کرلیا ہے۔ اب میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ میرا اسکول ایک مثالی اسکول بن کر ترقی کرے گا۔'' مریم آپا نے مسکرا کر اسے گلے لگالیا۔

دوسرے روز داور شہر گئے۔ جاتے ہوئے سارہ سے کچھ کہہ کر نہیں گئے۔ مگر وہ جانتی تھی

کہ جو بیج اس نے ان کے دل میں بویا ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس میں کونپلیں پھوٹیں گی اور تناور درخت بن کر بچّوں کو پناہ دیں گی۔ لوہا گرم تھا، اس نے آخری چوٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

داور شام کو لوٹے۔ کریم بھائی کار گیراج میں رکھنے گئے اور داور نے حویلی کی طرف قدم بڑھایا۔ آنگن میں قدم رکھتے ہی ان کے پاؤں حیرت سے جم گئے۔ کئی لمحے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ پھر وہ غصّے سے کانپنے لگے۔

''بیگم سارہ احمد جیلانی!'' وہ زور سے چیخے۔

''جی فرمایئے...'' سارہ فوراً ہی حاضر ہوگئی، جیسے کہیں نزدیک ہی ان کی پکار کی منتظر رہی ہو۔

''یہ کیا ہے؟''

''کہاں؟'' وہ انجان بن گئی۔

''یہ بچّے...؟'' غصّے کی زیادتی کے سبب ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''اپنے ہوسٹل کے بچّے ہیں... کھیل رہے ہیں۔''

''ہم پوچھتے ہیں ہمارے کھلونے انھیں کس نے دیئے؟''

''میں نے... میں نے آپ کی طرف سے دیئے ہیں۔ میں نے سوچا بند کمرہ اور دیواریں کھلونوں کی جگہ نہیں ہیں، یہ تو بچّوں کے ہاتھوں میں اچھے لگتے ہیں۔'' سارہ نے بے خوفی سے کہا۔

''آپ نے...! آپ نے اس کی جرأت کیسے کی؟ آپ کو ہماری نجی چیزوں کو ہاتھ لگانے کا اختیار کس نے دیا؟ آپ نے ہماری جان سے زیادہ عزیز چیزیں ان بچّوں میں تقسیم کردیں۔ ہم... ہم آپ کو شوٹ کردیں گے...''

وہ پاؤں پٹکتے ہوئے اپنے کمرے میں گئے۔ کریم بھائی دوڑتے ہوئے ان کے پیچھے تھے۔ انھوں نے کمرہ اندر سے بند کرلیا۔ سارہ کتنی ہی دیر گم صم کھڑی رہی۔ پھر مریم آپا اسے زبردستی لے گئیں۔ بچّے بھاگ کر پہلے ہی کمروں میں پناہ لے چکے تھے۔

سارہ پریشان تھی۔ اس نے یہ تو ضرور سوچ رکھا تھا کہ داور سخت ردِّعمل ظاہر کریں گے۔ مگر وہ اس طرح آپے سے باہر ہوجائیں گے کہ اسے شوٹ کردینے تک کی بات کریں گے، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ داور کمرہ بند کرکے پڑے رہے۔ رات کو کھانا کھایا نہ کریم بھائی کی عاجزانہ پکار کا جواب دیا۔ کسی طرح سارہ نے رات گزاری۔ سویرے اٹھتے ہی مصروف ہوگئی۔ پھر داور

کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''جاگیردار صاحب... دروازہ کھولیے۔ چل کر دیکھ لیجیے۔ ہم نے آپ کا 'اذیت خانہ' دوبارہ آباد کر دیا ہے۔''

داور نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ سارہ بغیر ان کی طرف دیکھے آگے بڑھ گئی۔ داور نے دیکھا۔ تمام چیزیں جوں کی توں اپنی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

''جاگیردار داور زماں صاحب، میں نے نئے کھلونے دلانے کا وعدہ کر کے بچوں سے آپ کے کھلونے واپس لے لیے۔''

''آپ نے ہمارے خزانے کے لیے 'اذیت خانہ' کا لفظ استعمال کیا۔'' داور دانت پر دانت جما کر بولے۔

''غلط نہیں کہا ہے۔ یہ اذیت خانہ ہی ہے جہاں آپ خود کو اذیت دیتے ہیں۔ اچھا ہوا جو آپ کی شادی نہ ہوئی ورنہ آپ اپنے بابا جان سے زیادہ جلاّد ثابت ہوتے۔ آپ نے اپنے بچوں کے لیے اذیت خانہ تو پہلے ہی تیاّر کر رکھا ہے۔ آپ انھیں اس کمرے میں لاتے اور کہتے، ''دیکھو وہ یہ کھلونے ہیں، جن سے ہمارے بابا جان نے ہمیں کھیلنے نہیں دیا۔ ہم بھی تمھیں کھیلنے نہیں دیں گے۔ ہم بھی تمھیں اسی اذیت میں مبتلا کریں گے جس میں ہم آج تک مبتلا رہے ہیں۔

سارہ طنز سے ہنسی۔ ''آپ نے اپنے بچپن ہی کو کیل پر نہیں ٹانگا، اپنی جوانی بھی سولی پر چڑھا دی ہے۔ آپ خود غرض ہیں۔ کوئی آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے تو آپ اس کی قدر نہیں کرتے۔ اور ہاں مجھے میری حیثیت یاد دلانے کا شکریہ۔''

سارہ نے پھر داور کا سامنا کرنا ہی ترک کر دیا۔ کسی مشورے کی ضرورت ہوتی تو مریم آپا کے ذریعے چٹ لکھ کر بھیج دیتی۔ وہ دور سے نظر آتے تو سارہ راستہ بدل دیتی۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ اسکول کی طرف لگا دی تھی۔ اسکول کے بعد داور کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے گاؤں میں نکل جاتی۔ خواتین کو صاف صفائی کی تلقین کرتی، کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ اسی دوران تعلیم بالغان کا نیا منصوبہ اس کے دماغ میں پلنے لگا۔ ایک شام وہ اسی مسئلے پر غور کرتی ہوئی بیٹھی تھی کہ داور آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔

''خیرت...'' اس نے انھیں سلام کر کے دریافت کیا۔ ''میرے لائق کوئی خدمت؟''

''آپ نے بچّوں کو نئے کھلونے دلانے کا وعدہ کیا تھا...'' وہ آہستگی سے بولے:

''ہاں... ایک دو روز میں شہر جاؤں گی...''

''وہ ہم... ہم بہت سے کھلونے خرید کر لائے ہیں۔ بچّوں میں تقسیم کر دیجیے...''

''میں اس لذّت سے واقف ہوں جو دوسروں کو خوشی دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ کبھی آپ بھی یہ تجربہ کر کے دیکھیں...'' سارہ نے بے رُخی سے کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

داور ہارے ہوئے جواری کی طرح اسے دیکھتے رہ گئے۔ اندر جانے پر مریم آپا نے کہا۔ ''تمھیں داور میاں کو اتنی سخت بات نہیں کہنی چاہیے تھی'' تو سارہ کو احساس ہوا۔ واقعی اس سے زیادتی ہوئی ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس آئی۔ داور جا چکے تھے۔ وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا کرے۔ پھر اُس طرف چل پڑی جہاں بچّوں کی رہائش تھی۔ مگر ٹھٹک کر رہ گئی۔ داور پیکٹ کھول کر کھلونے بچّوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ کریم بھائی اور دونوں ملازم ان کی مدد کر رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں بگل تھا کسی کے ہاتھ میں سیٹی۔ ایک چھوٹا بچّہ اپنے قد کے برابر کے بھالو کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ وہ داور جنھیں کبھی کسی نے مسکراتے نہ دیکھا تھا ہنس ہنس کر بچّوں کو پکار رہے تھے:

''منّے... ببلو... اِدھر آؤ دُور کیوں کھڑے ہو۔ یہ کھلونا لو۔ وہ پرانے خراب کھلونے تھے۔ یہ نئے اور اچھے والے کھلونے ہیں۔''

پرانے کھلونوں کے ذکر پر سارہ کی نظر 'اذیت خانے' کی طرف اُٹھ گئی۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ برہنہ دیواریں اور خالی کمرہ دُور سے نظر آ رہا تھا۔ وہ بے تحاشہ دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی۔ ''یہاں کے... یہاں کے کھلونے کہاں گئے؟'' وہ خوشی اور ہذیان کے عالم میں تقریباً چیخ کر بولی۔

چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ داور کچھ نہیں بولے۔ آخر کریم بھائی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''وہ تو اسی روز مالک نے پچھواڑے کے سوکھے کنویں میں ڈال دیئے تھے۔''

سارہ نے دروازے پر سر ٹیک دیا اور بے اختیار رونے لگی۔

کریم بھائی ملازموں کو اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے۔ مریم آپا جو سارہ کے پیچھے آئی تھیں، خاموشی سے بچّوں کو سمیٹ لے گئیں۔ داور کو احساس ہوا کہ آس پاس کوئی نہیں تو آہستگی سے قدم بڑھا کر سارہ کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ چند لمحوں تک اسے مخاطب کرنے

کے بارے میں سوچتے رہے۔

سارہ...!'' انھوں نے پکارا۔

''سارہ کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ ''جی...!'' اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

''سارہ...! ہم نے کیل پر ٹنگے اپنے بچپن کی قید سے نجات حاصل کر لی ہے۔ تم یہی چاہتی تھیں نا؟''

سارہ نے سر جھکا لیا۔ داور کچھ توقف کر کے بولے: ''ہم لاگ لپیٹ نہیں جانتے۔ سیدھے سیدھے کہہ دیں گے جو ہمیں کہنا ہے۔ اجازت ہے؟''

سارہ نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بچپن کے بعد زندگی کی جو منزل آتی ہے اس میں ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم تم سے درخواست کرتے ہیں سارہ کہ ہماری زندگی میں آ جاؤ، ہماری رفیقِ حیات بن کر۔'' داور نے بے حد پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ہم نہیں سنتے آپ کی بات.... جو کہنا ہو مریم آپا سے کہیے...'' سارہ نے ان ہی کے انداز میں کہا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

○○

چلو، اب مر جائیں!

لکشمی کو کھانا بنانے میں آج کچھ دیر ہوگئی تھی۔ اشوک تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھا اور پیپر پڑھنے لگا۔ اسی وقت بوڑھی نرملا اس کے پاس پہنچ کر عاجزی سے بولی۔ ''بیٹا، کچھ روپے دے دو۔''

''کس لیے؟'' اشوک آنکھیں نکال کر بولا۔

''نرملا نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا'' تمھارے پتا کو سمدر پور لے جا کر وید جی کو دِکھالاتی ہوں۔ بہت نام سنا ہے ان کا۔''

'' کیسے لے جاؤ گی؟'' اشوک پیپر تہہ کر کے رکھتا ہوا بولا'' چلنا بھی ہوتا ہے ان سے۔''

''میں چلا کر لے جاؤں گی کیسے بھی'' نرملا نے مضبوط لہجے میں کہا۔'' مگر جانے کے لیے روپے تو ہوں۔''

''تم سے سنبھلیں گے وہ؟'' اشوک چِڑ کر بولا'' کچھ بھی بات کرتی ہو۔''

نرملا کے دل میں آیا کہ کہہ دے جب جانتے ہو کہ مجھ سے سنبھلیں گے نہیں تو خود کیوں نہیں ساتھ چلتے؟ مگر مصلحت کے مدِّ نظر پر سکون لہجے میں بولی: ''سنبھل جائیں گے۔ نہ سنبھلیں گے تو جاوید بھائی کے کلیم کو ساتھ لے لوں گی۔ دن بھر خالی تو رہتا ہے۔''

''اشوک بھڑک گیا۔ دانت پیس کر بولا'' میری بدنامی کروگی؟ ڈھنڈورا پیٹو گی کہ بیٹے کو فرصت نہیں اس لیے محلّے کے لڑکوں کو لے کر وید حکیم کے چکّر لگاتی ہو۔''

''میں نے کب کسی سے کچھ کہا بیٹا؟'' اس کے بھڑ کنے سے نرملا سہم گئی۔

''بیٹا دھیان نہیں دیتا، بہو پوچھتی نہیں، پوتی کو دم بھر پاس نہیں آنے دیتے، یہ سب کس

نے کہا محلّے والوں سے؟'' اشوک کی آواز اور اونچی ہوگئی۔

نرملا نے بیٹے کے من کے چور کو پکڑ لیا۔ نظریں جھکا کر بولی: ''ماں پر الزام ہی لگانا ہے تو اور بات ہے ورنہ کسی کے بولنے کی کیا ضرورت؟ محلّے والوں کو کیا دِکھائی نہیں دیتا کہ ہم بڈّھا بڈّھی کیسے دن کاٹ رہے ہیں؟''

''آرام سے پڑے ہیں گھر میں، دونوں وقت کا کھانا ملتا ہے، اور کیا چاہیے تمھیں؟'' اشوک بھِنا کر بولا۔

''جینے کے لیے کھانا ہی کافی نہیں ہوتا بیٹے... اور آرام سے پڑے ہوتے تو میں تم سے روپے مانگتی کیوں؟ تم تو کوٹھری میں جھانکتے نہیں۔ تمھیں کیا پتہ تمھارے پِتا کس تکلیف سے گزر رہے ہیں۔'' نرملا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ تھوڑی سی عزّت، تھوڑی سی توجہ، تھوڑا سا پیار چاہیے ہوتا ہے جینے کے لیے، مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ بول نہیں سکتی تھی۔

لکشمی نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: ''ماں جی، کیوں آفس جاتے وقت ان کا موڈ خراب کرتی ہو، میں کھانا لا رہی ہوں۔ چین سے کھانے دو انھیں۔''

''روپے دے دو بیٹا۔'' نرملا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ''میں چلی جاتی ہوں۔''

''کہاں سے لاؤں؟ روپے پیڑ میں تو لگتے نہیں کہ ہلایا اور جھڑ پڑے۔ ابھی پندرہ دن پہلے تو دوائیں لا کر دی تھیں۔ روپے نہیں ہیں۔''

نرملا کو سخت ضرورت تھی۔ تہیہ کر چکی تھی کہ پتی کو وید کے پاس لے جا کر رہے گی۔ اس لیے پھر گڑگڑائی: ''کرایے کو ہو جائیں بس اتنے روپے دے دو۔ وید جی کے تو پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں گی۔'' اسے یقین تھا وید جی بیٹے کی طرح پتّھر دل نہ ہوں گے۔

''کہا تو نہیں ہیں... پھر بھی لگا رکھا ہے اِتنے دے دو، اُتنے دے دو۔'' اشوک زور سے چلاّیا تو نرملا بھونچکی ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ ماں کا یہ حال دیکھ اشوک شرمندہ ہوا، بولا: ''نہیں ہیں روپے، ہوتے تو دے دیتا۔''

نرملا بیٹے کے نرم لہجے پر نثار ہوتی ہوئی بولی: ''بہو سے مانگ کر دیکھو۔ شاید اس کے پاس ہوں۔''

''اس کے پاس بھی نہیں ہوں گے۔ اور ماں کاہے کو اتنا شور مچاتی ہو۔ ڈاکٹر نے تو کہہ دیا

ہے کہ پتا جی کا مرض لاعلاج ہے۔ انھیں صبر کرنا ہوگا۔ درد برداشت کرنا ہوگا۔''

''پھر بھی بیٹا، جب تک سانس ہے، تب تک آس ہے۔ سمدر پور والے وید جی کی دوا سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوا ہے۔ سمدر پور پاس ہوتا تو پیدل چلے جاتے مگر بس کا کرایہ تو چاہیے نا۔ وہ دے دو بیٹا۔''

''پھر وہی، کتنی بار کہوں کہ روپے نہیں ہیں۔ تمھیں یقین کیوں نہیں آتا۔ کھاؤں تمھاری سوگندھ!''

نرملا کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ لکشمی ٹیبل پر کھانے لگانے لگی۔ کوٹھری میں پہنچی تو بلونت نے پوچھا: ''لے آئی روپے؟''

نرملا بولی: ''مہینے کے آخری دن ہیں نا۔ اشوک کے پاس روپے نہیں ہیں۔''

''بہو کے پاس!''

''بہو کے پاس بھی نہیں ہیں۔''

''نرملا۔'' بلونت آہستہ سے بولا: ''تیرے پاس بھی نہیں ہیں؟''

''میرے پاس!'' نرملا حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

''ہاں، تیرے پاس دس پانچ روپے ہوں تو زہر لا کر کھلا دے مجھے۔ چھٹی پا جاؤں میں۔ مجھ سے اب درد برداشت نہیں ہوتا۔''

نرملا نے لپک کر بلونت کے ہاتھ تھام لیے اور بے اختیار رونے لگی۔ روتی ہی رہی یہاں تک کہ بلونت نے کہا: ''مجھے معاف کر دے۔ میں جانتا ہوں، میں جب بھی مرنے کی بات کرتا ہوں تو رونے لگتی ہے۔ مگر میں بھی کیا کروں؟ مجھے لگتا ہے مر کر ہی مجھے اس درد سے چھٹکارا ملے گا۔''

نرملا سسکتی رہی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بلونت کراہ کر بولا: ''نرملا، زندگی کی جمع پونجی کل پندرہ ہزار روپے تھے۔ وہ مجھے اشوک کو نہیں دینے چاہیے تھے۔''

''نہ دیتے تو اشوک یہ مکان کیسے خریدتا؟ اپنے ہی بیٹے کو دیئے ہیں نا۔ پھر ملال کیوں کرتے ہو؟''

''نہ خریدتا مکان، رہتا کرایے کے گھر میں، جیسے ہم زندگی بھر رہے۔ سوال تو یہ ہے کہ ہم نے اسے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، ملازمت سے لگایا اور آج ہم پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں۔ اس

کے پاس باپ کی دوا کے لیے روپے نہیں ہیں۔"

نرملا بولی: "دل پر نہ لو جی۔ سچ مچ اس کے پاس روپے نہیں ہوں گے... ہوتے تو ضرور دے دیتا۔"

"ماں، ماں ہی رہے گی، زندگی بھر اس کے کیے پر پردہ ڈالتی رہی۔ اب بھی اس کی طرفداری کیے جا رہی ہے۔"

"نہیں، میرا دل کہتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس نے میری سوگندھ کھا کر کہا کہ روپے نہیں ہیں۔ مجھے نا کہتے ہوئے اُسے دُکھ ہو رہا تھا۔" کہتے کہتے نرملا کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اشوک اس پر چلاّیا تھا... وہ لرز گئی۔ بلونت جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا، آہستہ سے بولا: "نرملا، ذرا گھٹنوں کو سہلا دے۔"

نرملا قریب ہو کر اس کے گھٹنے سہلانے لگی تو بلونت نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا: "جینے کو کس کا من نہیں چاہتا۔ مجھے اشوک کے بیٹے کو گود میں کھلانے کی بڑی تمنا ہے۔ نکیتا بٹی کو اسکول جاتے دیکھنے کی آرزو ہے۔ مگر نرملا، تُو یہ مت سمجھ کہ میں صرف جسمانی درد سے پریشان ہو کر مَوت مانگتا رہتا ہوں۔ ایک ہی تو اولاد ہے وہ گھڑی بھر کو مسکرا کر میری طبیعت پوچھ لے تو شاید درد میں کمی ہو جائے۔ مجھے بیٹے کی عدم توجہی زیادہ دُکھ دیتی ہے نرملا۔ نہ دل کے درد میں راحت ملتی ہے نہ گھٹنوں کے درد سے نجات ملتی ہے تو مر کر ہی سکون ملے گا اب۔"

نرملا بولی: "دل چھوٹا نہ کرو۔ وید جی کی دوا سے ضرور فائدہ ہوگا۔ میں روپیوں کا جگاڑ کرتی ہوں۔"

"روپے مل سکیں تو زہر ہی لا دے نرملا۔ میں وید جی تک نہ پہنچ سکوں گا۔ مجھے مر جانے دے۔"

"تو ٹھیک ہے، دونوں ساتھ ساتھ جیے، اب ساتھ ہی مریں گے بھی، نرملا فیصلہ کن انداز میں بولی۔

بلونت چکرا کر بولا: "کیا کہتی ہے؟ تو کیوں مرے گی؟ تجھے بڑھاپے کے سوا کیا بیماری ہے؟ تو کیوں ایسی ویسی بات سوچتی ہے؟"

"تمھارے بِنا جی کر کیا کروں گی؟ ابھی تمھیں کچھ ہوتا ہے تو مجھے آواز دیتے ہو؟ مجھے کچھ ہوگا تو میں کسے آواز دوں گی؟ کون میرے گھٹنے سہلائے گا؟ کون مجھے سہارا دے کر چلائے گا

پھرائے گا؟ کون میرے آنسو پونچھے گا؟ کون میرے کھانے پینے کا خیال رکھے گا؟ کون میری دوا کی فکر کرے گا؟ مجھے جینے کا حوصلہ دے گا۔''

اس مرتبہ تو بلونت بھی رونے لگا۔ دونوں بہت دیر تک آنسو بہاتے رہے، پھر نرملا نے اُٹھ کر ایک گلاس پانی اسے دیا، ایک گلاس خود پیا پھر بولی: ''ٹھہرو، تمھارے لیے چائے بنالاتی ہوں۔''

''رہنے دے۔'' بلونت نے اسے روک دیا۔ ''بہو کھانے کے لیے پکارتی ہی ہوگی۔''

کھانا کھانے کے بعد نرملا اپنی کھاٹ پر لیٹ گئی... بولی: ''سنو جی، ایک بات بتاؤ، ایک آدمی کے کریا کرم پر کتنا خرچ آتا ہے؟''

''دیکھ، اب تو خود مَوت وَوت کی بات نکال رہی ہے۔ میں شروع کرتا ہوں تو الزام دیتی ہے۔'' بلونت نے مذاقیہ لہجے میں کہا ''بھلا کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''بس یوں ہی، بات کرنے کو کچھ تو ہو۔''

''آج کل لکڑی بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ پھر اور خرچ ہے۔ سماج میں رہتے ہیں تو دِل میں بھلے نہ ہو مگر تیرہویں کرنا پڑتا ہے۔ کافی خرچ ہو جاتا ہے۔''

نرملا کچھ نہ بولی۔ بلونت ہی نے کہا: ''میں سمجھ گیا، تو سوچ رہی ہے کہ اشوک کے پاس میری دوا کے لیے روپے نہیں ہیں تو کریا کرم کا خرچ کہاں سے کرے گا وہ! ہے نا یہی بات۔'' وہ ہنسنے لگا۔ ''تُو بہت بھولی ہے نرملا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ آدمی کو اپنے بڑھاپے کے لیے کچھ رقم بچا کر رکھنا چاہیے۔ اشوک ناٹک کرتا ہے۔ ایک دو دن میں دونوں گھومنے جاتے ہیں، ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ نت نئے کپڑے خریدتے ہیں۔ ان سب کے لیے روپے کہاں سے آتے ہیں؟ اس نے کہا اور تُو نے مان لیا۔''

بلونت زور سے ہنسا اور یہ ہنسنا غضب ہوگیا۔ اس کی سانس پھولنے لگی۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ نرملا اس کا سینہ سہلاتی جاتی، تسلّی دیتی جاتی۔ ''ناتھ، تھوڑا صبر کرو، ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دس پندرہ منٹ میں بلونت کی سانسیں معمول پر آگئیں۔ نرملا نے اسے دوائی دی۔ اس پر غنودگی طاری ہوگئی تو اپنی کھاٹ پر جالیٹی۔ اس کی آنکھیں چھت پر لگی تھیں اور خیالوں کے

قافلے تیزی سے منزلیں سر کر رہے تھے۔

بلونت کی نیند کھلی تو کوٹھری میں اندھیرا تھا۔اس کے گھٹنوں میں بڑی زور کا درد ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی ہتھوڑا لے کر انھیں کوٹ رہا ہے۔اس نے نرملا کو پکارنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔وہ تکلیف سے بلبلانے لگا۔

اسی وقت نرملا اندر آئی۔بتّی جلائی۔بلونت کی حالت غیر دیکھی تو جھپٹ کر اس کے پاس پہنچی۔بولی: ''ناتھ! بس کچھ دیر اور صبر کرو۔میں ذرا حاجی نصیر احمد کے بنگلے تک چلی گئی تھی۔''

بلونت نے آنکھوں سے سوال کیا ''کیوں گئی تھی؟'' پھر تکلیف سے آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔

''معلوم ہوا، وہاں زکوٰۃ بٹ رہی ہے۔میں بھی جا کر قطار میں لگ گئی۔میرا نمبر آیا تو میں نے جنّن اماں کے پاؤں پکڑ لیے۔رو رو کر تمھارا حال بتایا تو ہزار روپے دیئے ہیں جنّن اماں نے۔''

''ہزار روپے!'' حیرت سے بلونت کی آنکھیں کھُل گئیں۔

''ہاں'' نرملا نے اُٹھ کر دو گلاسوں میں پانی نکالا اور ان میں کوئی سفوف حل کرنے لگی۔

''تو پھر دوا لائی ہے تُو؟''

نرملا نے اپنی دُھن میں کہا ''لوٹتے وقت مندر گئی، بھگوان کو پرساد چڑھایا۔لو پہلے یہ پرساد کھا لو'' اس نے پیڑا بلونت کے منہ میں دے دیا اور گلاس آگے بڑھاتی ہوئی بولی: ''اب آنکھ اور ناک بند کر کے اسے پی جاؤ۔'' دوسرا گلاس خود اپنے منہ سے لگا لیا نرملا نے۔

''نرملا'' بلونت نے پوچھا ''کیا تھا یہ، بہت کڑوا تھا۔''

''زندگی کی حقیقتوں سے کم ہی کڑوا ہوگا ناتھ! اشوک نے میری سوگندھ کھائی تھی... کیٹ ناشک کے لیے بھی روپے چاہیے تھے اور کریا کرم کے لیے بھی... اس لیے میں زکوٰۃ مانگ لائی۔بھگوان ہمارے بیٹے کو اچھا رکھے۔''

پلنگ پر بیٹھ کر نرملا نے اپنا سر بلونت کے قدموں پر رکھ دیا اور بولی: ''ناتھ! چلو، اب مر جائیں!''

OO

بنگلے کی ڈیوٹی

''دھرما، او دھرما! پاٹل صاحب ڈیوٹی لگا رہے ہیں۔ جا جلدی۔''

ادھیڑ اے ایس آئی گری راج نے ڈنڈا بجا کر دھرمیندر کو آواز دی۔ گری راج بہت ہی کائیاں شخص تھا۔ بغیر مطلب کبھی کسی کے کام نہیں آتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی ذرّہ بھر نہیں بدلا تھا۔

تمام زندگی وہ دوہری شخصیت جیتا رہا۔ اکثر ہی ایسا ہوتا کہ دل ہی دل میں کسی پر دانت پیس رہا ہوتا مگر زبان اُسی کی خوشامد میں مصروف ہوتی۔ بجا ہے، مجبوری میں بہت سے لوگوں کو اکثر دوغلا پن کرنا پڑتا ہے مگر گری راج کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری قطعی نہیں تھی۔ بس دوغلا پن اس کے مزاج میں تھا۔ ہنستے ہنستے کسی کو غلط راستہ بتا دینا یا غلط صلاح دے کر تماشہ دیکھنا اُسے بے حد مرغوب تھا۔

دھرما کئی روز سے اُس کی خوشامد کر رہا تھا کہ پاٹل صاحب سے کہہ کر بنگلے کی ڈیوٹی لگوا دے۔

دھرما دُور کے رشتے سے اُس کا سالا لگتا تھا مگر سالے کا بھلا کرنے سے زیادہ گری راج کا انٹرسٹ پاٹل سے اُس کا بگاڑ کرانے میں تھا۔ اس کا سبب پرانی رنجش تھی۔ گری راج کے اِن دنوں، رانی سے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔ پیپل تالاب کے چکلے پر ایک دن چھاپہ مارا گیا تھا۔ رانی وہیں اُسے ملی تھی۔ نئی نئی پنجرے میں پھنسی یہ چڑیا گری راج کو بھا گئی۔ صاف بچا گیا اُسے۔ دھرما کو خبر ہو گئی۔ اپنی بجّی کے پاس جا کر نمک مرچ لگا کر گری راج جیجا کے رانی سے تعلقات کے بارے میں جڑ دیا۔ گھر کی فضا مہینوں خراب رہی تھی۔

دھرمیندر عرف دھرما چھلانگ مار کر پاٹل صاحب کے سامنے جا پہنچا ''صاحب میری ڈیوٹی لگا دو بنگلے پر۔''

''کیوں؟ کیا ہے وہاں؟'' ایس آئی پاٹل، جس کی مونچھیں دن رات کے چوبیسوں گھنٹوں میں اوپر کو چڑھی رہتی تھیں، غرایا۔

پاٹل کی مونچھیں پورے ضلع میں مشہور تھیں۔ بڑی محنت سے پالی گئیں یہ مونچھیں چہرے کے نچلے حصے پر بُری طرح چھائی ہوئی تھیں۔ ہونٹ نظر نہ آتے، دانت دِکھائی دینے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ مونچھوں کی حرکت سے اُس کے بولنے، ہنسنے، دہاڑنے، چلاّنے کا پتہ چلتا۔ آنکھیں کسی جذبے سے خالی رہتیں۔

دھرمیندر جھٹ اٹینشن ہو گیا۔ ہکلا کر بولا...''وہ...وہ مجھے معلوم ہوا ڈیوٹی لگ رہی ہے۔''

''ہوں...تو پھر؟'' مونچھیں زور سے ہلیں۔

''میری ڈیوٹی بڑے صاحب کے بنگلے پر...'' دھرمیندر نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مونچھوں میں زلزلہ آ گیا...''گوگی صاحب تھے تو ڈیوٹی پر جانے میں تیری نانی مرتی تھی۔ اب خود ہو کر ڈیوٹی مانگ رہا ہے۔ پکّا حرمزادہ ہے تُو؟ کیا بات ہے؟ بتا سیدھے سیدھے۔''

پکّا کھلاڑی تھا پاٹل۔ سپاہی بھرتی ہوا تھا، آج ایس.آئی بن گیا تھا۔ تھرڈ ڈگری کے ماہرین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اُس کی عقابی نظریں جسم کے آرپار دیکھ لیتیں۔ مجال تھی کہ کوئی اس سے جھوٹ بول کر بچ نکلتا۔ آج بھی یہ حال تھا کہ کسی کو دیکھتا تو انداز ایسا ہوتا جیسے، جیسا وہ دکھائی دے رہا ہے اُس کے ویسا ہی ہونے میں اُسے شک ہے۔

دھرمیندر نے اٹینشن ہی کھڑے رہ کر کنکھیوں سے گری راج کو دیکھا جو شاید اس خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ اب سالے کو کینچلی چھوڑنی ہی پڑے گی۔

دھرمیندر دانت نکال کر بولا...''بات یہ ہے باس...''

''باس نہیں، صاحب بول۔ سالا ناٹک کرتا ہے!'' پاٹل کی مونچھیں تھرتھرانے لگیں جو اس بات کا مظہر تھیں کہ وہ ہانپ رہا ہے۔ ''چھپّن مرتبہ کہا ہے کہ ڈائیلاگ نہ مارا کر۔''

''صاحب، بنگلے سے کالج قریب ہے۔ میں نے بی.اے پارٹ ون کا فارم بھرا ہے۔ کالج کی لائبریری سے کتابیں لینے میں آسانی ہوگی...بس یہی بات ہے۔'' ایک سانس میں کہہ گیا وہ۔

''سچ کہہ رہا ہے یہ؟'' مونچھیں سوالیہ انداز میں گری راج کی طرف مُڑ گئیں۔

''ہاں صاحب، فارم بھرا تو ہے اس نے۔'' گری راج نے تصدیق کی۔

''پڑھائی کر کے کیا کرے گا؟ ممبئی جا۔ فلموں میں کام کر — ناچ زنخوں کی طرح۔''

پاٹل کی مونچھیں جلدی جلدی اوپر نیچے ہونے لگیں۔ اپنے بھونڈے مذاق پر اُسے بہت ہنسی آ رہی تھی۔ اس کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ دھرمیندر غلطی سے پولیس ملازمت میں آ گیا ہے۔ اُسے تو فلم انڈسٹری میں قسمت آزمانی چاہیے تھی۔ بننے سنورنے، ڈائیلاگ بولنے، ناچنے مٹکنے میں اُسے خاص دلچسپی تھی۔

دھرمیندر نے پاٹل کے ریمارک پر کوئی خاص ردِ عمل نہیں ظاہر کیا تو پاٹل کو محسوس ہوا واقعی معاملہ گمبھیر ہے۔ فوراً اپنی ہنسی میں بریک لگا کر سامنے ٹیبل پر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا: ''اچھا چل! لگا دی تیری ڈیوٹی! کل سیرے ادھر ہی جانا۔ مگر دیکھ، بائی صاحب کی شکایت نہ آئے۔ شکایت آئی تو صاحب کو بول کر آدی واسی علاقے میں پھنکوا دوں گا۔ وہاں رہ کر ان کی عورتوں کی سوکھی ٹانگیں دیکھ دیکھ کر فلم کا بھوت سر سے اُتر جائے گا۔''

''ٹانگیں...'' دھرمیندر کے دماغ نے پچیس مرتبہ یہ لفظ دُہرایا۔ ایڑیاں بجا کر اُس نے سلیوٹ مارا اور پلٹ کر دم لیا گری راج کے نزدیک۔ اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر ایک ایک لفظ چباتا ہوا بولا: ''تھینک یو مائی ڈیئر۔ جّاجی! لگ گئی ڈیوٹی۔''

اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کب ڈیوٹی ختم ہو اور وہ ہری موہن کو یہ خوش خبری دے۔

ہری موہن اور دھرمیندر لنگوٹیا یار تھے۔ نوکری میں ساتھ لگے۔ تین برسوں تک وردھا میں ساتھ ملازمت کی۔ وہاں ڈی. جے کے بنگلے پر پکیٹنگ کے لیے دونوں مل کر جاتے تھے۔ دونوں کی کوئی بات کوئی راز ایک دوسرے سے چھپا نہیں تھا۔ اس شہر میں تبادلے پر دونوں ساتھ آئے مگر ہری موہن کی ڈیوٹی لگی بنگلے پر اور دھرمیندر کی تھانے میں۔

نئے صاحب آ رہے تھے اس لیے ہری موہن بہت مصروف تھا۔ کئی دنوں تک دھرمیندر سے نہیں مل سکا۔ نیا صاحب آتے ہی بنگلے میں اپنی پسند کے مطابق تبدیلیاں کراتا ہے چاہے بنگلہ پہلے ہی سے سجا سجایا کیوں نہ ہوتا۔ سپاہیوں کی شامت آ جاتی۔ پریڈ گراؤنڈ سے دس پندرہ تیس چالیس سپاہی سیدھے بنگلے پر بھیجے جاتے۔ گھر کی ڈیوٹی والے سپاہی بھی ہوتے۔ پورے بنگلے کو رنگ و روغن کر نئی دلہن کی طرح سجا دیا جاتا۔

ایک رات ہری موہن دھرمیندر سے ملنے آیا تو بڑا خوش تھا۔ اُسے پولیس گراؤنڈ کی پُلیا پر لے جا کر بولا: ''یار دھرما، میں تو پرستان پہنچ گیا رے!''

اُس نے ایس آئی پاٹل کی مونچھوں کی خیریت پوچھی نہ گری راج کے ڈنڈے کی۔ بس شروع ہو گیا۔ وہ سب اُگل دیا جو اس کے دل و دماغ میں اُتھل پتھل مچا رہا تھا۔ صاحب کی نوخیز اور حسین ماڈرن وائف کے بارے میں بتاتے بتاتے اس کی رال ٹپک پڑتی تھی۔

''بائی صاحب تو بس بائی صاحب ہیں۔ ایک دم پٹاخہ، سیکس بم۔ فلم اداکاراؤں کی مانند غسل خانے سے تولیہ لپیٹ کر باہر آتی ہیں۔ گھر میں گھٹنوں سے اونچی کھلے گریبان والی نائیٹی پہنی رہتی ہیں، آستین بھی نہیں، پائینچے بھی نہیں... پھر شام کو صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہیں چڈی پہن کر۔'' وہ منہ دبا کر ہنسنے لگا۔

''چڈی پہن کر؟؟؟'' دھرمیندر اُچھل پڑا۔

''ہو... بابا ہو۔ چڈی بنیان پہن کر۔''

''ابے! کچھ بھی بولتا ہے تو۔'' دھرمیندر بے یقینی سے بولا۔

ہری موہن بڑے اعتماد سے بولا: ''آ کر دیکھ لے ایک دن۔''

''کیسے دیکھ لوں؟'' دھرمیندر کا گلا سوکھنے لگا۔

''بحث کیوں کرتا ہے؟'' ہری موہن نے ڈپٹ کر کہا: ''میرے پاس گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آ جا۔ کوئی ٹکٹ تھوڑی لینا پڑے گا۔ مفت میں تماشہ دکھا دوں گا۔''

دھرمیندر کی بے چینی دیکھ کر ہری موہن کو اور جوش آ گیا۔ اُس نے بنگلے کے خانساں اور مالی کے مشاہدات کا بھی ذکر شروع کر دیا۔ ''کھانا بنانے والا پنڈت پچاس برس کا بڈھا ہے مگر بدمعاشی سے باز نہیں آتا۔ کہتا ہے 'صاحب سے ڈر لگتا ہے اس لیے اُن کے سامنے نظر نیچی ہی رکھتا ہوں مگر ٹیبل پر جتنی مرتبہ ڈِش رکھنے یا سرو کرنے جاتا ہوں، چپکے سے جھانک لیتا ہوں'۔ بولتا ہے اس تاک جھانک کے بعد زندگی کا پہیہ الٹی طرف گھومنے لگتا ہے۔''

''بدمعاش ہے۔'' دھرمیندر نے کہنے بھر کو کہہ دیا مگر تجسس کو نہ روک سکا۔ پوچھ بیٹھا: ''اور مالی... مالی کیا کہتا ہے؟''

ہری موہن ہنسا ''مالی رامیا ایک روز باغیچے میں گُڑائی کر رہا تھا کہ بائی صاحب نزدیک

آ کر کھڑی ہوگئیں۔ کسی کے قریب کھڑے ہونے کے احساس سے چونک کر اُس نے نظریں اٹھائیں تو ننگی ٹانگیں دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اب تو وہ دل ہی دل میں دُعا کرتا ہے کہ بائی صاحب کے باغیچے میں آنے پر ہَوا نہ چلے تو اچھا۔''

''ہَوا نہ چلے، کیا مطلب؟'' دھرمیندر نے حیرت سے پوچھا۔

''توبہ توبہ!'' ہری موہن منہ پیٹنے لگا۔ ''اب میں تجھے مطلب کیا سمجھاؤں؟ مطلب تو میں نے بھی رامیا سے پوچھا تھا۔ اُس نے جو کچھ مجھے سمجھایا وہ میں تجھے نہیں سمجھا سکتا۔''

دھرمیندر منہ کھولے بیٹھا رہا۔ ہری موہن کی زبان پھر کھجلانے لگی ''وہ تو کہو، بائی صاحب بیڈروم کے سوا اِدھر اُدھر لیٹتی نہیں ہیں ورنہ... اے. سی کے بغیر انھیں نیند نہیں آتی ہے۔ تو تو کب آ رہا ہے؟''

تمام رات دھرمیندر کروٹیں بدلتا رہا۔ ہری موہن کی باتیں اُس کے دماغ میں گھومتی رہیں اور وہ سوچتا رہا... گویا صاحبوں کے بنگلے بھوت بنگلے ہی نہیں، پرستان بھی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ پہلے بھی اُسے بنگلے کی ڈیوٹی ملی تھی۔ سب نے بہت ڈرایا تھا کہ مت جاؤ بڑی مشکل میں جان ہوتی ہے وہاں۔ بنگلے میں بائی صاحب کا حکم چلتا ہے۔ اپنے صاحب بھی گھر میں بائی صاحب کے ماتحت ہوتے ہیں۔ بچّے الگ دھونس جماتے ہیں۔ اِن کا کام کرو کہ اُن کے نخرے اٹھاؤ۔

نئی نئی نوکری تھی دھرمیندر کی۔ مرضی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بنگلے پر پہنچا تو معلوم ہوا صاحب اکیلے رہتے ہیں۔ فیملی دوسرے شہر میں ہے۔ اب بھلا کہو تو؟ گھر مکان میں جب فیملی نہیں تو چار چار سپاہیوں کی ڈیوٹی لگانے کا مطلب؟ مگر نہیں، چار سپاہی گن لیے اِدھر اُدھر کھڑے نہ ہوں گے تو معلوم کیسے ہوگا کہ ایس. پی صاحب کا بنگلہ ہے... پھر صاحب کا بنگلہ ہے بھٹیا گھر نہیں کہ خالی چھوڑ دیا جائے۔ فون آتے تو جواب دینا پڑتا کہ صاحب کہاں گئے ہیں؟ کب تک لوٹنے کی امید ہے؟ یا وہ کہاں مل سکیں گے؟ کوئی ملنے آتا تو ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر ٹھنڈا پانی پیش کرنا پڑتا۔ تحفے تحائف سنبھال کر رکھنا پڑتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بور ہوگیا دھرمیندر۔ ایس. آئی کی خوشامد کر کے ڈیوٹی بدلوالی تھی۔

سویرے تک دھرمیندر تہیہ کر چکا تھا کہ بنگلے پر ضرور جائے گا مگر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے

نہیں، دو تین دن کے لیے جائے گا۔ ہری موہن سے کہے گا چھٹی چلا جائے۔ خود اُس کے بدلے میں ڈیوٹی دے گا۔ اور جی بھر کر نظارہ کرے گا پرستان کی پری کا۔

وہ کچھ کرتا اس سے پہلے ہی ہری موہن آ کر بتا گیا کہ وہ گاؤں جا رہا ہے۔ اُس کی شادی طے ہوگئی ہے۔ وہ کوشش کر کے اپنی ڈیوٹی لگوا لے۔

دھرمیندر نے ہری موہن سے کہلوایا۔ گری راج سے سفارش کرائی۔ یہاں تک کہ بی اے پارٹ ون کا فارم تک بھر ڈالا اور یہ آخری ترکیب ہی کارگر ہوئی۔ پاٹل میں چاہے سو خرابیاں ہوں، تعلیم کا زبردست حامی تھا۔

ہری موہن تین ہفتے بعد اپنی دُلہن کو لے کر واپس آیا تو دھرمیندر سے سخت ناراض تھا۔ وہ اس کی شادی میں نہیں پہنچا تھا... مگر اُسے خبر ملی کہ دھرمیندر کو لائن حاضر کر دیا گیا ہے۔ اُس نے بغیر بتائے بنگلے کی ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔

وہ دھرمیندر کے پاس پہنچا ''کیوں؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟ تم نے خود مانگ کر ڈیوٹی لی تھی۔''

''میں نے کب انکار کیا ہے۔'' دھرمیندر پتھر ہوا میں اچھالتا ہوا بولا: ''مانگ کر ڈیوٹی لی تھی۔ جاتا بھی تھا اب دل نہیں چاہتا وہاں جانے کو۔ چھوڑ دیا جانا۔''

''کیوں؟ بھلے آدمی کیوں؟ کوئی خالہ جی کا گھر تھا کہ گئے گئے نہ گئے۔'' ہری موہن چڑ کر بولا۔

''یار! تو تو پیچھے پڑ گیا۔ کیا کروں اب وہاں جا کر'' دھرمیندر بے دلی سے بولا۔ ''بائی صاحب اب پورے کپڑے پہننے لگی ہیں۔''

OO

صلیب پر ٹنگی عورت

شہلا نہایت جوش وخروش سے اپنے کالج اور اپنی سہیلیوں کے بارے میں بتائے جارہی تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہ بہت بولتی تھی، پھر ادھر دو مہینوں بعد ماں سے ملی تھی۔ کافی دیر بعد اس کا دھیان اس طرف گیا کہ شاہین اُس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی ہیں۔

''امّی! کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے؟ چہرہ بُجھا بُجھا سا ہے... کیا کوئی فکر کھائے جارہی ہے آپ کو؟'' شہلا نے پوچھا تو شاہین اُداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں: ''ہاں بیٹی! فکریں تو ہیں مگر وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں کیا، تمھارے پاس وقت ہے؟''

''امّی، بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ کہیے۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟''

''یہ جلال کون ہے؟'' شاہین نے اچانک سوال داغ دیا۔

''اوہ!'' شہلا لمحہ بھر کے لیے نروس ہوگئی ''آپ کو کس نے بتایا؟'' پھر دفعتاً بپھر کر بولی: ''میں سمجھ گئی۔ پھوپھی جان نے اُلٹا سیدھا کچھ لکھ مارا ہے۔ مگر امّی میں کہے دیتی ہوں۔ میری سنے بغیر پھوپھی جان کی باتوں پر یقین نہ کرلیجیے گا۔''

''شہلا، اپنی حد میں رہو۔ تمھاری پھوپھی نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں لکھی ہے... صرف اتنا لکھا ہے کہ پورے کالج میں تمھارے اور جلال کے چرچے ہورہے ہیں۔ انھوں نے تم ہی سے پوری بات جاننے کی صلاح دی ہے مجھے۔''

''امّی، میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ کیا بات ہے۔''

''میں نے پوچھا ہے جلال کیسا لڑکا ہے؟'' شاہین نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''مجھ سے پوچھتی ہیں تو میں کہوں گی غنڈہ ہے، بدمعاش ہے۔ کالج میں پڑھنے نہیں، عشق لڑانے آتا ہے۔ اس نے میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔'' شہلا غصّے اور شرمندگی سے رُوہانسی ہو کر بولی۔

اسرار اور شاہین کی اِکلوتی بیٹی تھی شہلا۔ بے مثال حُسن اور عقل و فراست کی مالک۔ یہی سبب تھا کہ اسرار جو لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے یکسر خلاف تھے، اُسے آگے پڑھانے کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ شہلا سے بڑا ان کا ایک بیٹا تھا جو بنگلور میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ شہلا کو شہر اُس کی پھوپھی کے گھر بھیج دیا گیا جہاں رہ کر اُس نے اس سال بی۔اے کا امتحان دیا تھا۔

اسرار اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے شاید اسی لیے دقیانوسی خیالات اور دقیانوسی ذہنیت تھی ان کی پھر نہایت ہی گرم مزاج تھے۔ بیوی بچّے سب اُن سے خوفزدہ رہتے تھے۔ ان کی بہن جس کے پاس رہ کر شہلا نے تعلیم حاصل کی تھی، وہ بھی ان سے بہت کھُلی ہوئی نہیں تھی۔

پرانے زمین دار تھے وہ لوگ۔ اسرار اور شاہین ابتدا ہی سے گاؤں میں رہے۔ بچّوں کو شہر میں رکھ کر تعلیم دلائی گئی۔

چند ماہ پہلے شہلا کی پھوپھی گاؤں آئی تھیں۔ دونوں نند بھابی گھنٹوں سر جوڑ کر باتیں کرتی رہتی تھیں۔

شاہین نے نہایت نرم اور سلجھے ہوئے انداز میں کہا: ''بیٹی! کیا تم مجھے تفصیل سے بتاؤ گی کہ جلال نے کس طرح تمھارا جینا دوبھر کر رکھا ہے؟ تم مجھے اس وقت اپنی امّی نہ سمجھو۔ سہیلی سمجھ کر صاف صاف سب بتا دو۔''

شہلا نے حیرت سے ماں کو دیکھا پھر نظریں نیچی کر کے بولی: ''جلال ایم۔اے کے پہلے سال میں پڑھتا ہے۔ وہ تمام وقت میرے پیچھے گھومتا رہتا ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں وہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ امّی، اُس نے مجھے بدنام کر دیا۔ سب اُسے مجنوں کہتے ہیں۔''

''اوہ!'' شاہین نے اُسے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا: ''تم نے ابھی اُسے غنڈہ، بدمعاش کہا تھا۔ کیا بدمعاشی کی اُس نے تمھارے ساتھ؟''

''یہ بدمعاشی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہر طرف میری بدنامی کر دی... مجھے اُس سے نفرت ہے امّی۔'' کہہ کر شہلا سسکنے لگی۔

شاہین اُس کی پشت ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں: ''یہ بتاؤ۔ ادھر کچھ دنوں سے اُس کے رویے میں کوئی فرق آیا ہے؟''

شہلا آنکھیں خشک کرتی ہوئی بولی: ''امتحانات نزدیک تھے نا۔ پڑھائی میں مصروف تھا... کچھ دِنوں سے اُس نے اپنی سب خراب حرکتیں بند کردی تھیں۔''

کیسی خراب حرکتیں؟'' شاہین نے مشکوک ہوکر پوچھا۔

شہلا بھڑک کر بولی: ''دن رات پاگلوں کی طرح کسی کے پیچھے گھومنا کیا مناسب ہے؟ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا مگر اُس کے ساتھی تو آوازیں کستے تھے۔ لڑکیاں تو مجھے چھیڑتی تھیں۔''

''شہلا!'' شاہین بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتی ہوئی بولیں ''سچ بتاؤ کیا کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ جلال تمھیں پسند کرتا ہے؟ حقیقتاً تم سے محبّت کرتا ہے۔''

شہلا ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

شاہین نے طویل سانس لے کر کہا ''میں تمھیں تفصیل بتاتی ہوں۔ تمھاری پھوپھی نے یہاں آکر مجھے بتایا کہ کالج میں تمھارے اور جلال کے بہت چرچے ہورہے ہیں۔ انھوں نے تمھیں کوئی الزام نہیں دیا۔ بیٹی، اپنی پھوپھی پر شک نہ کرو۔ ہم دونوں نے جلال کو یہاں بلوایا۔ اُسے یہاں بلوانے سے پہلے تمھاری پھوپھی نے چھان بین کرلی تھی۔ وہ ایک خوشحال تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کردار بھی اس کا اچھا ہی ہے۔ جب ہم نے اُسے تمھارے پیچھے پڑنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے اقبال کیا کہ وہ تمھیں پسند کرتا ہے۔''

''پسند کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بدنام کردیا جائے۔ شہلا چڑ کر بولی۔

''یہی تو، یہی تو ہم نے اُسے سمجھایا کہ وہ پہلے اپنی تعلیم پوری کرکے ملازمت حاصل کرے پھر اپنے والدین کو رشتہ لے کر بھیجے تو ہم یہ رشتہ قبول کرلیں گے۔''

''مجھ سے پوچھے بغیر امّی آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' شہلا تیزی سے بولی ''میں ہرگز اُس سے شادی نہیں کروں گی۔''

''میری بات تو سن لو۔'' شاہین نے اُسی سکون سے کہا جس کا مظاہرہ اب تک کرتی آئی تھیں۔ ''ہم نے اس سے صاف کہہ دیا کہ پہلے اپنی وہ حرکتیں بند کردے جن کے سبب ہماری

بیٹی بدنام ہو رہی ہے... اور تم نے خود اعتراف کیا ہے کہ ادھر کئی دنوں سے اُس نے تمھیں پریشان نہیں کیا۔ اب ایک ماں ہونے کے ناطے میں تمھیں مشورہ دے رہی ہوں کہ جلال کے بارے میں دوسری طرح سوچو۔ اب تک تم نے اُس کی خامیوں ہی پر نظر رکھی ہے۔ اس میں کچھ خوبیاں بھی تو ہوں گی۔ سوچو، کافی وقت ہے تمھارے پاس۔''

''امّی!'' شہلا نے اچانک کسی خیال کے تحت پوچھا ''کیا ابّو کو ان سب باتوں کا علم ہے؟''

''نہیں، قطعی نہیں۔'' شاہین نے سنجیدگی سے اعتراف کیا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ زندگی میں پہلی مرتبہ آپ نے اتنا بڑا فیصلہ تنہا کیا ہے۔ کیا ابّو اسے پسند کریں گے؟ ویسے میں نے ابھی جلال کے حق میں رائے نہیں دی ہے۔ مجھے سوچنے کے لیے یقیناً وقت چاہیے۔''

شاہین مسکرا کر بولیں: ''پہلی مرتبہ نہیں، دوسری مرتبہ ایسا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے فرزند اور تمھارے بھائی جان ایک لڑکی پسند کر چکے ہیں اور میں نے انھیں یقین دلایا ہے کہ وہی لڑکی ان کی شریکِ حیات بنے گی۔ بات تو یہ ہے کہ تم دونوں کبھی اپنے ابّو کے اتنے قریب نہیں رہے کہ ان سے دل کی بات کہہ سکو... اور رہی یہ بات کہ انھیں یہ فیصلے پسند آئیں گے یا نہیں تو اسے مجھ پر چھوڑ دو۔''

شہلا نے حیرت سے ماں کو دیکھا پھر بولی: ''آج آپ میں مجھے ایک نئی امّی نظر آ رہی ہیں۔''

''سو دن بعد تو گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں بیٹی۔'' شاہین نے سنجیدگی سے کہا ''میں اب بھی اگر خاموش رہوں گی تو تم بھی زندگی بھر اسی طرح تِل تِل جلوگی جیسے میں جلی ہوں۔'' ایک لمحہ کے توقف کے بعد انھوں نے کہا: ''بیٹی، عورت کی زندگی کانٹوں کی سیج ہے... کم سے کم میری زندگی تو کانٹوں ہی میں بسر ہوئی ہے۔ تمھارے ابّو نے ذلّت، الزاموں اور بے اعتنائی کے کانٹوں سے تازندگی میرا کلیجہ بیندھا ہے... کیوں؟ ایسا کرتے رہے وہ؟ وہ بھی سن لو۔ جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تب میرے ساتھ بھی وہی ہوا جو آج تمھارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا مجھ سے خاموش محبت کرتا تھا۔ اُس نے نہ کبھی مجھ سے اظہارِ محبت کیا نہ مجھ سے قریب آنے

کی کوشش کی...کالج سے بات نکلی اور لوگوں کے منہ چڑھی۔ میری امّی اور ابوّ نے یہ افواہیں سُنیں تو میرا کالج جانا بند کر دیا گیا۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اُس لڑکے کے گھر سے رشتہ آیا تو لوٹا دیا گیا اور تمھارے ابوّ سے میری شادی کر دی گئی۔"

شہلا نے نہایت تجسّس سے پوچھا: "پھر کیا ہوا امّی؟"

"پھر..." شاہین پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولیں: "پھر تمھارے ابوّ نے مجھے صلیب پر ٹانگ دیا...انھوں نے کہیں سے کچھ سن لیا تھا۔ نہ مجھ سے کچھ پوچھا نہ صفائی پیش کرنے کا موقع دیا۔ بس یک طرفہ فیصلہ کر لیا کہ میرا کردار اچھا نہیں 'بدچلن عورت' کے سوا انھوں نے کبھی مجھے کسی دوسرے نام سے نہیں پکارا...اب تم پوچھو گی کہ پھر ہم نے اتنے برسوں تک ازدواجی زندگی کی گاڑی کیسے کھینچ لی؟ کیسے گزاری زندگی؟

"سچ! کیسے گزاری زندگی امّی؟" شہلا نے بے اختیار آنکھوں میں آ گئے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

"شادی ایڈجسٹمنٹ کا دوسرا نام ہے۔ میں نے پہلے تو اسے ان کا مزاج سمجھ کر برداشت کیا...پھر مجبوری میں خاموش رہی۔" شاہین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کیا مجبوری تھی امّی آپ کے ساتھ؟ آپ نے ابوّ سے علیحدگی کیوں نہ اختیار کر لی؟"

"اس لیے کہ مجھ سے کئی زندگیاں وابستہ تھیں۔ تین چھوٹی بہنیں تھیں جن کی شادیاں ہونی تھیں۔ ان کی شادیاں ہونے تک ظفر اور تم میری گود میں آ گئے۔ تمھارے مستقبل کے لیے میں نے کوئی انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔"

"اوہ! امّی، آپ کتنی گریٹ ہیں۔" شہلا بے اختیار شاہین سے لپٹ گئی... "مگر میں ابوّ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔"

شاہین اپنی آنکھوں کے گوشے خشک کرتی ہوئی بولیں: "اگر شوہر کا پیار اُس کا اعتماد حاصل نہیں ہے تو سمجھو ہر عورت صلیب پر ٹنگی ہوئی ہے۔ دشمن کو گولی ماردی جائے اُسے زہر دے دیا جائے، اُسے لمحہ بھر میں زندگی سے محروم کر دیا جائے، یہی مردانگی ہے۔ تڑپا تڑپا کر مارنا بہادر کو زیب نہیں دیتا...مگر تمھارے ابوّ نے مجھے صلیب پر ٹانگنے ہی پر اکتفا نہیں کیا...وقفے وقفے سے ایک ایک کیل ٹھونکتے رہے، جس سے میں مر سکی اور نہ ہی سکھ سے جی سکی۔"

''تو کیا امّی...اسی لیے آپ نے جلال سے بات کی ہے؟'' شہلا یکایک بولی۔

''اور کیا؟'' شاہین نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''جو تمھیں چاہتا ہے بیٹی، اُس کی قدر کرو۔ جو ایڈجسٹمنٹ کرتے ہیں وہ پیار نہیں کرتے — یہ مردوں کی دُنیا ہے... یہاں ان کے کیے کا جواب طلب کرنے والا کوئی نہیں مگر عورت کی معمولی سی لغزش کا جواب طلب کرنے ہر کوئی تیاّر رہتا ہے... میں نے تمام زندگی تمھارے ابو کے سوا کسی مرد کے بارے میں... خیال نہ کیا مگر کالج کے زمانے کے اُس واقعہ کو لے کر تمھارے ابو نے مجھے ہمیشہ ذلیل کیا... ہمارے معاشرے میں ایسی سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔ تم بس اتنا یاد رکھو کہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار کہلایا جانا بہت تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ باوفا ہوتے ہوئے بھی بے وفائی کی صلیب پر چڑھایا جانا اور گھٹ گھٹ کر مرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ کسی لڑکی کو تمھارے ابو جیسا شکّی شوہر ملے... پھر تم تو میری بیٹی ہو۔''

شہلا نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ ''آج پہلی مرتبہ آپ کے اندر چھپی ہوئی عورت سے ملاقات ہوئی ہے۔ میں آپ کی خواہش کا احترام کروں گی۔ آپ میرے لیے جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔''

دونوں ماں بیٹی بہت دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگی روتی رہیں پھر اچانک شہلا کسی خیال کے تحت چونک کر بولی: ''امّی، اسے گستاخی پر محمول نہ کریں۔ ایک سوال میرے دل میں جاگا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بگڑے ہوئے زمین دار، خردماغ رئیس، جاہل مرد اکثر ایسی باتوں پر عورتوں کو طلاق دے دیتے ہیں... ابو بھی تو...''

شاہین نے بیٹی کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا ''وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔''

شہلا کی نظروں میں خاموش سوال اُبھرا۔ ''کیوں نہیں کر سکتے تھے؟''

''ایک بڑی بے بس سی مسکراہٹ شاہین کے ہونٹوں پر پسر گئی۔ وہ خلا میں تکتی ہوئی بولیں۔ کیونکہ اپنے شک کی بے بنیادی سے وہ خوب واقف تھے۔ مگر مرد ہیں نا! مرد کبھی جُھکا ہے؟''

OO

شاید نہیں

ناہید ٹرین میں کھڑکی کے پاس کی سیٹ پر بیٹھی باہر پھیلے نظاروں میں گم تھی۔ جنگل، تاڑ کے جھنڈ، کیلے اور گنوں کے باغیچوں میں کبھی نظر اُلجھ کر رہ جاتی تو اُس کی سوچ کے بے لگام گھوڑوں کو لگام لگ جاتی ورنہ وہ ریس کے گھوڑوں کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔

باغیچوں کے شہر میسور میں کانفرنس کے لیے روانہ ہوتے وقت ناہید نے وہ کچھ نہیں سوچا تھا جو واقع ہو گیا تھا۔ اُس کے شوہر پروفیسر حامد علی پیپر پڑھنے والے تھے اس لیے جانا ضروری تھا ورنہ آج کل سیر و تفریح کے نام سے خوش ہونا اُس نے چھوڑ دیا تھا۔

پہلے روز کی پہلی نشست میں پروفیسر نے پیپر پڑھا۔ بے حد سراہا گیا۔ خوب بحث ہوئی۔ شام کو دونوں جب ہوٹل لوٹے پروفیسر بے حد مسرور تھے۔ ناہید نے موقع کا فائدہ اُٹھایا۔ دوسرے روز میسور گھوم آنے کی تجویز رکھ دی اور حیرت کہ پروفیسر بخوشی رضامند ہو گئے۔ ناہید سمجھی تھی ہمیشہ کی طرح کہیں گے: ''تم تنہا چلی جاؤ۔ میں نشست میں جاؤں گا۔ میں اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو کانفرنس کے بہانے سیر سپاٹے کو نکلتے ہیں۔ تم بھی گرہ میں باندھ لو۔ علم بڑھانا ہے، تجربہ حاصل کرنا ہے تو دوسروں کو پیپر پڑھتے ہوئے سنو، بحث میں حصہ لو۔ خود مقالہ تیار کرو۔''

پروفیسر کے ہمیشہ بولے جانے والے یہ جملے ناہید کو ازبر ہو گئے تھے۔ اُس کا خیال تھا پیپر کی کامیابی کا نشہ کم از کم ایک روز تو پروفیسر کو مسرور رکھے گا اس لیے اصرار کر بیٹھی تھی۔ اُس کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ سویرے لوکل ٹور پر نکلے آدھا گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ پروفیسر بور ہونے لگے۔ ناہید کا بچپنا انھیں کھلنے لگا۔ دونوں اپنے اپنے خول کے اندر سمٹنے لگے۔

چامُنڈی ہل پر بس پہنچی تو مندر تک لے جانے والے طویل راستے کے پہلے ہی موڑ پر پروفیسر بیٹھ گئے۔ ''مجھ سے چلا نہ جائے گا۔ تم دیکھ آؤ۔'' ناہید خاموش رہ گئی۔ ایک بار بھی اُن

سے چلنے کے لیے نہیں کہا۔ کہتی بھی تو پروفیسر سب کے سامنے ڈانٹ دینے میں جھجک محسوس نہ کرتے۔ وہ دوسرے مسافروں کے ساتھ چل پڑی، بجھی بجھی سی، کھوئی کھوئی سی... یہ تو سیر کی شروعات تھی، شام تک بے توجہی کے جانے کتنے ہی پتھر اُسے ڈھونے تھے۔ مندر کے سامنے پہنچ کر وسیع آنگن کے ایک کونے میں وہ کھڑی ہوگئی۔ مندر کے فنِ تعمیر اور خوبصورتی نے اُسے بے حد متاثر کیا۔ پتھر میں کھدی مورتیوں کو وہ سحر زدہ سی دیکھ رہی تھی کہ ایک مردانہ آواز نے اُس کی محویت ختم کردی ''ناہید! خدا کے لیے مجھے پہچان لو۔ میں شاکر ہوں ناہید۔''

ناہید نے چونک کر دیکھا۔ اُلجھے گھنے بال، چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی موٹی موٹی ذہین آنکھیں۔ گلے میں کیمرہ، چہرے پر معصوم مسکراہٹ، وہ شاکر کو فوراً ہی شناخت نہ کرپاتی اگر اُس نے خود اپنا تعارف نہ کروایا ہوتا۔ وہ آج کل اسی طرح خیالوں میں گم رہنے لگی ہے۔ کسی چیز پر نظر رُکتی بھی ہے تو خیال کہیں اور ہونے سے دونوں میں کوئی رشتہ نہیں جڑنے پاتا۔ یہ وہی شاکر تھا جس کے ساتھ اُس کے ماضی کی بہت سی سنہری یادیں وابستہ تھیں۔ جس کے ساتھ گھر بسانے، زندگی گزارنے کے خواب اُس نے دیکھے تھے۔ مگر خوابوں کی تکمیل انسانوں کے اپنے ہاتھ کب ہوتی ہے۔ پھر اُس نے تو عورت کا جنم لیا تھا، عورت جو ہر یگ میں اگنی پریکشا دیتی ہے پھر بھی شک کی صلیب پر ٹنگی رہتی ہے۔

مرد جب اپنے پیار میں ناکام ہوجاتا ہے محبوبہ کو شریکِ حیات نہیں بنا پاتا تب وہ شریکِ حیات میں محبوبہ کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے محبوبہ کی عادات وخصائل اپنانے کو مجبور کرتا ہے۔ اُس سے پیار کرتے وقت محبوبہ کا تصور کرتا ہے۔ اس کے برخلاف عورت نے کسی سے پیار کیا ہو تو شادی کے بعد اُس کا نام لینے سے خوف کھاتی ہے۔ اُس کو تصور میں لانے سے ڈرتی ہے۔ اپنی دس سالہ ازدواجی زندگی میں ناہید نے شاکر کو تقریباً فراموش ہی کردیا تھا۔ حالانکہ کئی بار ایسے مواقع آئے تھے جب دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور رونے کے لیے اُسے کسی کے کندھوں کی تلاش ہوئی تھی۔ خود کو محفوظ تصور کرنے کے لیے کسی کی مضبوط بانہوں کا سہارا درکار ہوا تھا مگر وہ پروفیسر کے سوا کسی اور کی طرف دیکھ نہ پائی تھی۔ تہذیب اور شرافت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ خاوند کو مجازی خدا مان کر سب کچھ برداشت کرلو۔ سب گھٹن پی جاؤ۔

شاکر نے اپنا تعارف کرایا تو اُسے یاد آیا یہ تو اُسی کی بس میں سفر کررہا ہے۔ جگ موہن

پیلیس آرٹ گیلری میں اُس عجیب وغریب گھڑی کو دیکھنے میں شاکر ہی نے اُس کی مدد کی تھی۔ پروفیسر کا قد اونچا تھا۔ بڑے اطمینان سے پیچھے کھڑے ہوگئے تھے۔ ناہید کا اُچک اُچک کر گھڑی دیکھنا انھیں ناگوار گزر رہا تھا۔ اُسی وقت آگے کھڑے ہوئے شاکر نے پیچھے مڑ کر کہا تھا ''آپ یہاں سامنے آجائیے۔'' شاکر کے سامنے پہنچ کر اُس نے وہ دلفریب منظر دیکھا تھا۔ اُس گھڑی میں ایک کھلونا بینڈ پارٹی تھی جو ہر ایک گھنٹے کے بعد دلنواز موسیقی کے ساتھ تین چکّر لگاتی تھی اور پھر اپنی جگہ لوٹ کر کھڑی ہوجاتی تھی... شاکر کے اس سلوک کو وہ ایک مہذّب شخص کی شرافت کے سوا کوئی نام نہ دے پائی تھی تب۔

شاکر اور ناہید ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ ناہید نے جب بی.ایس.سی میں داخلہ لیا تب شاکر ایم.ایس.سی میں تھا۔ وہ ناہید کی طرف متوجہ ہوا تو ناہید اُس سے بے رُخی نہ برت سکی۔ دو سال تک کسی امانت کی طرح انھوں نے اپنے پیار کی حفاظت کی۔ پھر حالات نے انھیں جدا کر دیا۔ شاکر ملازمت کے چکّر میں بمبئی کی جگمگاہٹ میں کھو گیا۔ ناہید بیگم حامد علی بن گئی۔

ناہید کی طویل خاموشی شاکر کے دِل کو اور چوٹ پہنچا گئی.... بہت بھاری دِل سے بولا: ''تم نے مجھے پہچانا نہیں اس غم میں سویرے سے جل رہا ہوں۔ اب تمھاری خاموشی دل میں نشتر لگا رہی ہے... وہ دن کہاں گُم ہوگئے ناہید؟ تمھیں پا کر میں سمجھا تھا میرا نصیب چاند تاروں سے زیادہ درخشاں ہے۔ آسمان سے زیادہ بلند ہے۔ ہمالیہ سے زیادہ عظیم ہے... تمھیں کھو بیٹھا تو محسوس ہوا مجھ سے بڑا بدنصیب بھی دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تم نے مجھے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ جس دوزخ میں دن گزار رہی ہو اُس کی طرف ہلکا سا اشارہ ہی کر دیتیں۔''

ناہید نے ایک طویل سانس لی۔ ''یہ سب قسمت کی باتیں ہیں شاکر۔ میرا نصیب غریب کے گھر کی گیلی لکڑی کی طرح ہے جسے ہر حال میں جلنا ہے چاہے خاموشی سے جلے چاہے دھواں دے کر... میں نے پہلا حل ہی مناسب سمجھا۔ تمھارا اتا پتا تھا نہیں، ہوتا بھی تو تم سے کہنے نہ جاتی۔ شاکر عورت کا دِل وہ نازک آبگینہ ہے جسے بہت سنبھال کر رکھنا ہوتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے وہ چیخ جاتا ہے۔ وہ ہیرا ہے جسے ماہر تراشنے والا ملے تب ہی صحیح قیمت ملتی ہے، وہ سونا ہے جسے مُناسب آب ملے تو ہی نکھرتا ہے۔ میں نے زندگی میں ان سب باتوں کی آس ہی چھوڑ دی ہے... وہ دیکھو ہمارا گائیڈ چلنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ بقیہ باتیں

’ز‘ میں کریں گے۔ وہاں بھی پروفیسر یہ کہہ کر ایک طرف بیٹھ جائیں گے کہ کیا دیکھنا ہے؟ سب جگہ ایک ہی جیسے جانور ہوتے ہیں۔‘‘

ناہید بے حد تلخی سے ہنسی۔ شاکر کے دل میں تیر کی طرح یہ ہنسی اُترتی چلی گئی۔ یہ وہی ہنسی تھی جس پر کبھی نظاروں کے ہنسنے کا گماں ہوتا تھا، بہار کی گنگناہٹ کا خیال آتا تھا، پھولوں کے کھلنے، چاندنی چھٹکنے اور چشمے کے ترنم کی تشبیہات سوجھتی تھیں۔ کتنی بدل گئی تھی ناہید!

زولوجیکل پارک میں پروفیسر نے ایک طرف بیٹھ کر اخبار نکال لیا۔ شاکر اور ناہید نے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ شاکر نے ناہید کو بغور دیکھتے ہوئے کہا: ’’تمھاری یہ کھوئی کھوئی آنکھیں، تمھاری ایک ایک بات چغلی کھاتی ہے کہ تم کسی محرومی کا شکار ہو۔ کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں؟ تم ماں نہیں بن سکیں یہی نا لیکن ناہید، دُنیا میں اور غم بھی ہیں۔ تم درس وتدریس کے معزز پیشے سے منسلک ہو۔ کیا یہ مثالی طرزِ زندگی بھی تمھیں اس غم میں جلنے سے نہیں روک سکی۔ گھٹ گھٹ کر جینے سے کیا فائدہ؟‘‘

ناہید نے کہا: ’’ٹھیک کہتے ہو تم، میں نے اپنی محرومیوں کو کالج کی مصروفیتوں کے پاس رہن رکھ دیا ہے۔ مگر یاد رکھو شاکر عورت اپنے بانجھ پن کی کبھی عادی نہیں ہوتی۔ ہر بچے کو دیکھ کر اُس کا یہ احساس جاگ اُٹھتا ہے کہ تقدیر نے یاوری کی ہوتی تو وہ تہی دامن کیوں ہوتی۔‘‘

’’پروفیسر کی سابقہ بیوی سے ایک لڑکا ہے؟‘‘

ناہید نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’شاکر! تم نے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو گڑیوں سے کھیلتے دیکھا ہے کبھی؟ صرف گڑیا کی مالک ہو کر اُسے کندھے سے لگائے گھومنا ہی انھیں تسکین نہیں دیتا۔ اُسے نہلاتی دُھلاتی کھلاتی پلاتی ہیں وہ۔ نئے مکان میں منتقل ہونے پر پھلوں سے لدا پیڑ ملے تو کیا وہ اتنی خوشی دے گا جتنی ہمیں اُس پیڑ کے پھلوں سے ملے گی جسے ہم نے بچپن میں سینچا اور ہاتھوں کا لمس دے کر بڑا کیا ہوتا ہے۔ فنکار کے ہاتھوں میں ایک شاہکار دے کر کہا جائے اسے اپنے نام کا لیبل لگا کر دُنیا سے متعارف کراؤ تو اپنے فن کی توہین وہ گوارا کرے گا؟ سجانے سنوارنے کا حق تو اسے ملنا ہی چاہیے۔ یہ حق، فرض کرلو مل بھی جائے تو درمیان کے فاصلے کو کون پاٹ پائے گا؟ دنیا اُسے یاد دلاتی رہے گی۔ اپنے پرائے کا فرق بنا رہے گا۔ نہیں سمجھے کچھ؟ سنو... پروفیسر کا لڑکا عمر میں مجھ سے صرف پانچ برس چھوٹا ہے۔‘‘

شاکر حیرت زدہ اُسے دیکھتا رہ گیا۔ ناہید چلتے چلتے رُک گئی۔ پنجروں میں قید پرندوں کو دیکھتی ہوئی بھیگی آواز میں بولی: ''دوہاجو مرد، عورت سے کبھی انصاف نہیں کر پاتے۔ وہ بیوی نہیں بیاہ کر لاتے بلکہ بچّے کے لیے ماں لاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو نئی نویلی دُلہن کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر اپنی اولاد سے غفلت برتتے ہیں۔ ان دوسری طرح کے مردوں ہی نے اپنی کمزوری کو عورت کی پیشانی کا کلنک بنایا ہے۔ عورت جو صرف ماں ہے اُسے سوتیلی کا خطاب دے کر اُس کے مقام سے گرادیا ہے۔ میں کہتی ہوں مرد جو عورت سے برتر ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے، عورت کا مجازی خدا ہونے کے غرور سے چور ہے کیوں درمیان کا راستہ نہیں اپناتا۔'' آنسو بے اختیار اُس کی آنکھوں سے بہہ چلے۔ شاکر نے آگے بڑھ کر اُن آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کرلیا۔ ناہید کو غم زدہ کرنا وہ نہیں چاہتا تھا۔ خود کو خطاوار محسوس کررہا تھا۔ اُس کے جی میں آیا کہہ دے 'میری زندگی میں آجاؤ ناہید۔ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے میں اب بھی تمھارا منتظر ہوں۔ میں تمھارے سب غم پی جاؤں گا۔ تمھارے قدموں میں زندگی کی تمام خوشیاں ڈھیر کردوں گا'۔ مگر کہہ کچھ نہ سکا۔ شاید ابھی مناسب وقت نہیں آیا تھا۔

زولوجیکل پارک سے بس روانہ ہوئی تو ناہید گم سم بیٹھی اپنے ماضی کو یاد کرتی رہی۔ شاکر سے مل کر اُس کے زخم پھر کسک دینے لگے تھے۔ شاکر ایم.ایس.سی کر کے بمبئی گیا تو اُسے بھول ہی گیا۔ وہ کس آسرے پر اُس کا انتظار کرتی۔ کتنی لڑکیاں انتظار کا یہ بوجھ اُٹھا پاتی ہیں۔ اُس سے کہیں زیادہ مضبوط ہاتھ انھیں اس بوجھ سے آزاد کرنے والوں کے ہوتے ہیں۔ پروفیسر نے اُسے حاصل کرنا چاہا، کرلیا۔ شادی کے دو سال بعد کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر کا تقرر ہوگیا کامیابی اور شہرت اُن کے قدم چومنے لگی۔ وہ اونچے اور اونچے اُٹھتے چلے گئے۔ بھولتے گئے کہ اس اونچے اٹھنے میں کسی کو نیچے، بہت نیچے چھوڑتے جارہے ہیں۔ آج ایک جگہ لیکچر دینا ہے تو کل کہیں پیپر پڑھنا ہے۔ کسی ایسوسی ایشن کے چیئرمین کی حیثیت سے مصروف ہیں تو کسی ادارے کے بانی ہونے کی ذمّے داری اٹھائے ہوئے ہیں۔ کسی پروگرام کی صدارت کے لیے مدعو ہیں تو کہیں مہمانِ خصوصی کے فرائض نبھانے ہیں۔ ناہید نے ایک دن پروفیسر سے شکایت کی تو انھوں نے اُسے ایک کالج میں بھیج دیا۔ انٹرویو ہوا، تقرر کا پروانہ ملا اور اُسے مصروف رکھنے کا انتظام کردیا گیا۔

اِنڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کی ممبر ناہید اسی لیے بنی تھی کہ پروفیسر کے ساتھ

کانفرنس میں جائے گی تو کچھ گھوم پھر لے گی۔ ویسے تو پروفیسر اُسے کہیں نہ لے جاتے۔ انھیں سینما کا شوق تھا نہ سیر و تفریح کا۔ کچھ اُس کے لیے لاتے نہ اُسے خریدنے دیتے۔ ’’کیا کرو گی خرید کر؟ ڈھیروں تو ساڑیاں ہیں تمھارے پاس۔ شہر کیا دیکھنا ہے؟ سب شہر ایک جیسے ہوتے ہیں، مارکیٹ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بھیڑ میں دھکّے کھاتی پھرو گی... ٹھگی جاؤ گی...!‘‘ وغیرہ وغیرہ۔

ناہید کے اصرار پر میسور کے قابلِ دید مقامات دیکھنے نکل تو کھڑے ہوئے تھے مگر ناہید کی حرکتوں پہ چیں بجبیں ہو رہے تھے۔ بار بار اُسے ٹوکتے ’’یہ اس قدر شوخ رنگوں کی ساڑی کیوں پہنی؟ وہ ایک شخص مسلسل تمھیں گھور رہا ہے... اتنے زور سے نہ ہنسو- اب تم بچّی نہیں رہیں۔ پینتیس برس کی پختہ عمر کی عورت ہو‘‘، پروفیسر یہ سب فطری رشک وحسد کے زیرِ اثر کہتے تو ناہید خوش ہی ہوئی ہوتی مگر پروفیسر عادتاً یہ سب کہتے اور ناہید اُداس ہوتی جاتی۔ ایک پیشہ ور فوٹو گرافر کو دیکھ کر اُس نے پروفیسر کے ساتھ فوٹو کھنچوانا چاہا تھا۔ پروفیسر نے سب کے سامنے اُسے جھڑک دیا تھا۔ آنسو پلکوں تک آ کر ٹھہر گئے۔ بڑی مشکل سے رونے سے روک سکی تھی وہ خود کو۔

مہاراجہ کے محل پر بس پہنچی تو اُس عالی شان محل کو دیکھنے سے پروفیسر خود کو نہ روک سکے۔ چل پڑے۔ عورت بھیڑ میں اکیلی بھی چل لیتی ہے لیکن چاہتی یہ ہے کہ اُس کے شوہر کی مضبوط بانہیں، شوہر کا وجود اُس کے اور بھیڑ کے بیچ ڈھال بن کر اُسے دھکّوں سے محفوظ رکھے مگر پروفیسر کے آئین میں ایسے نازک احساسات کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ شاکر جو اُس سے کچھ فاصلے پر چل رہا تھا اُس کی حالت کو خوب سمجھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔

اُس عالی شان محل کی جاہ و عظمت نے ناہید کو کچھ وقت کے لیے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا۔ دیوانِ عام کی سجاوٹ اور دیوانِ خاص کی عظمت نے اُسے خاص طور سے مرعوب کیا... مگر محل دیکھنے کے بعد اُس کا دل اُچٹ گیا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔ سینٹ فلومینا کا بلند و بالا چرچ، کاویری سنگم کا دلفریب منظر، حیدر علی کے مقبرے کی شاندار خاموشی، رنگ ناتھ سوامی مندر کا پاکیزہ ماحول کچھ بھی اُس کی اُداسی ختم نہ کر سکے۔ مگر جب بس ورِنداون باغیچے کی طرف چلی تو اُسے کچھ راحت ملی۔ بہت نام سنا تھا اُس نے باغیچوں کے شہر کے اس سرتاج باغیچے کا۔

ورِنداون پہنچ کر وہ کھل اٹھی۔ واقعی اتنی کشش تھی اس میں کہ ہر دل کو باغ باغ کر دیتا۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتا... مگر پروفیسر آپ اپنا جواب تھے۔ گھاس پر ایک طرف بیٹھے ہوئے

بولے: ''تم گھوم آؤ بھئی۔ میرے پاؤں میں درد ہونے لگا ہے۔کل رنجیت ڈے پیپر پڑھ رہا ہے۔بحث کے لیے پوائنٹ چن لوں۔رات کو تھک کر سو جاؤں گا تو رہ جائے گا۔''

ناہید کے آگے بڑھتے قدم من من بھر کے ہو گئے۔اگر شاکر سامنے کھڑا نہ ہوتا تو وہیں پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔پروفیسر نے دیکھا بھی نہیں کہ وہ گئی ہے یا نہیں۔اپنا بریف کیس کھولنے میں لگ گئے۔

ورِنداون کو جھیل کے پانی نے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔جھیل کے کنارے کنارے دوسرے حصّے میں جانے کے لیے دوسرے مسافر چل پڑے تھے۔وہ دونوں بھی چل پڑے۔ ناہید کی آنکھوں میں آنسو تھے۔شاکر خاموش ہی رہا۔جھیل کے پار پہنچ کر دونوں نے ٹھنڈا شربت پیا پھر باغیچے کا ایک چکّر لگا کر لوٹ آئے۔اس حصّے میں شام کے ساڑھے چھ بجے فواروں پر رنگین روشنیاں ڈالی جاتی تھیں۔ان رنگین فواروں کے لیے ہی یہ باغ مشہور ہے۔ابھی کچھ وقت باقی تھا۔مالتی کے ایک کنج میں بیٹھ کر شاکر نے بہت دیر سے اپنے دل میں اٹھتے ایک سوال کو ناہید کے سامنے رکھ ہی دیا، ''تم نے آخر اس شخص سے شادی کیوں کی؟''

ناہید کی گھنیری پلکیں اُٹھیں، پھر جھک گئیں ''میں نے جب ایم.ایس.سی میں داخلہ لیا پروفیسر صدرِ شعبہ تھے۔میں انھیں پسند کرتی تھی۔وہ میرا آدرش تھے مگر شوہر کے رُوپ میں میں نے کبھی اُن کا تصوّر نہ کیا تھا۔دھیرے دھیرے میں نے جانا کہ وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔انھوں نے ماموں جان سے بات کی۔ماموں جان نے مجھ سے پوچھا۔میں نے سوچا کسی نہ کسی سے شادی تو ہونی ہے۔پروفیسر ہی سہی...''

''تم نے میرا انتظار کیوں نہ کیا ناہید۔''

''کس اُمید پر کرتی؟ تم کہہ کر تو نہیں گئے تھے کہ میرا انتظار کرنا—تم کہہ جاتے تو مرتے مر جاتی مگر کسی اور کی نہ ہوتی۔بزرگوں نے جو رشتہ پسند کیا بس اُس پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔شادی ہوئی ایک سال میں پروفیسر کی محبّت کا نشہ اُتر گیا۔پروفیسر ایک دم بدل گئے۔وہ نگاہیں جو ڈپارٹمنٹ بھر میں میرا پیچھا کرتی تھیں، جنھیں کالج میں میں ہی میں دکھائی دیتی تھی بدل گئیں۔میرا وجود ختم ہو گیا۔''

''میں نے ایک بھول کی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہا ہوں۔جس دل میں خلِش ہو وہ کہیں سکون نہیں پاتا۔تم اپنے رات دن کیسے گزارتی ہو ناہید؟''

''کالج کے بعد جو وقت بچتا ہے اُسے خواب دیکھنے میں گزارتی ہوں۔ خواب جمع کرتی ہوں میں! میرے خوابوں کا ذخیرہ دیکھو گے؟ دو خواب تو شادی سے پہلے دیکھے تھے۔ اچھا شوہر اور اچھا گھر پانے کا خواب اور دوسرا... دو پیارے پیارے بچّوں کی ماں بننے کا خواب... یہ دونوں خواب، خواب رہ گئے۔ اب ان میں مطمئن زندگی کا، خوش آئند مستقبل کا... وغیرہ وغیرہ کتنے ہی خواب جمع کر لیے ہیں میں نے۔''

اندھیرا بڑھ گیا۔ ایک لمحے میں ورِنداون میں رنگوں کا سیلاب آ گیا۔ فوّاروں نے رنگوں کے گہنے پہن لیے۔ بہتے پانی کی چال میں الھڑ دوشیزہ کی مستی بھر گئی۔ ماحول میں ہر طرف قہقہے گونج اُٹھے۔ شاکر کے دل میں ہوک اُٹھی۔ کاش ایسی ہی کوئی روشنی اُس کے دل کا اندھیرا دُور کر دیتی۔ فوّاروں کو روشنی کے لباس میں ایک نیا رُوپ مل گیا تھا۔ انھیں دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے تو شاکر نے ناہید کے بالکل قریب ہو کر سرگوشی کی ''ناہید تم چاہو تو میں آج بھی تمھیں اپنانے کو تیّار ہوں۔ میں نے اب تک شادی نہیں کی۔ یہ بات نہیں کہ مجھے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ضرورت محسوس ہوئی مگر تمھیں کھونے کے بعد دوسری کوئی لڑکی نظر میں سمائی ہی نہیں... تم انکار کرو گی تب بھی بُرا نہ مانوں گا۔''

ناہید سر سے پیر تک لرز گئی۔ وہیں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر تک آنچل انگلی پر مروڑتی رہی۔ پھر بولی: ''دس سال پہلے ان الفاظ کو سننے کے لیے میں ایک ایک پل گنا کرتی تھی... تمھارے ہونٹوں کی ایک ایک حرکت نوٹ کرتی تھی... مگر اب... اِن فوّاروں کو دیکھو شاکر۔ انھیں ہم نے اندھیرا ہونے سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ کیسا صاف شفاف تھا ان کا پانی۔ ایک مقررہ وقت پر رنگ برنگی روشنیاں ان پر پڑتی ہیں۔ تمام رات یہ پانی ان رنگوں کا بوجھ ڈھوتا ہے۔ سویرے پھر وہی سادہ پانی بن کر بہنے لگتا ہے۔ انسان کی زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔''

''تم میری بات کا جواب دو ناہید۔''

''اپنے الفاظ واپس لے لو شاکر! میں نے اپنی زندگی پروفیسر کے نام لکھ دی ہے۔ تمھارے سامنے آج اقبال کرتی ہوں کہ پروفیسر نے مجھے تھوڑی سی بھی خوشی نہ دی۔ ازدواجی زندگی کا کوئی سکھ نہیں دیا۔ اپنی سابقہ بیوی کی یادوں کی مالا پہنا کر، اپنے ہم عمر لڑکے کی ماں بننے کی مجبوری کی ہتھکڑیاں پہنا کر مجھے قید کر دیا۔ انھوں نے اپنا فرض نہیں نبھایا تو کیا میں بھی اپنے فرض سے کوتاہی کروں؟ پروفیسر محبت کے حقدار نہیں ہاں ہمدردی کے مستحق ضرور ہیں۔ والدین

کے لاڈلے تھے۔ بیوی نے بھی بے انتہا پیار دیا۔ اُس کی وفات کے بعد بیوہ پھوپھی نے انھیں سنبھالا۔ مجھ سے شادی ہوئی تو میں نے عورت کی ممتا اور محبت کی اس کڑی کو ٹوٹنے نہ دیا۔ اپنا رول بخوبی نبھاتی رہی۔ تمھاری بات مان لوں تو تمھاری محبت میں ڈوب کر میں سب کچھ بھول جاؤں گی مگر پروفیسر میرے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ وہ میرے عادی ہو گئے ہیں۔ شاکر! میں ایک ایسے شخص کے لیے محبّت کا دعویٰ واپس لے رہی ہوں جس نے کبھی جانا ہی نہیں کہ نفرت کیا ہوتی ہے... بے توجہی کیا چیز ہوتی ہے۔ ان فواروں کی طرح ہر رات میں اپنی بدنصیبی اور محرومی کا بوجھ اٹھائے ہوئے روتی ہوں، کڑھتی ہوں مگر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ میرا ایک وفادار بیوی کا، ایک ماں کا رول اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ یاد رہ جاتا ہے اپنا فرض..."

شاکر نے ناہید کا ہاتھ ہولے سے دبا دیا۔ تین روز بعد وہ لوگ کانفرنس سے لوٹ رہے تھے۔ کے.کے ایکسپریس میں اپنی برتھ پر سامان رکھ کر ناہید میگزین خریدنے کے لیے پلیٹ فارم پر اُتری تو شاکر نے آگے بڑھ کر ایک موٹا لفافہ اُسے تھما دیا۔ "تمھاری خواہش جان کر پروفیسر کے ساتھ تمھاری کچھ تصویریں کھینچ لی تھیں۔ پروفیسر سے تم کہہ سکتی ہو کہ تم نے کسی فوٹو گرافر سے کنٹریکٹ کر لیا تھا... کوئی اور مطلب نہیں تھا میرا... بس تمھاری خواہش کی تکمیل چاہتا تھا۔"

ناہید نے لفافہ سینے سے لگا لیا۔ اُسے دیکھتی رہی... پھر بولی: "اپنی آنکھوں سے ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالو شاکر۔ ایسا نہ ہو میں بہک جاؤں۔ اپنا ارادہ بدل دوں... مجھے تم معاف کر دینا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آج سے میرے خوابوں میں ایک گراں قدر خواب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مرنے کے بعد جنّت میں تمھیں پانے کا۔ تمھاری ہونے کا خواب۔"

جھاؤ کے جنگل ایک کے بعد ایک آتے گئے تو ناہید کی نظریں اُن میں اُلجھ کر اُسے گزری ہوئی یادوں کی بھول بھلیّوں سے نکال لائیں... کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی وہ... پروفیسر سیٹ پر نیم دراز کسی سائنس میگزین میں کھوئے ہوئے تھے۔ ناہید نے لفافہ کھولا... صندل آئل فیکٹری کے سامنے، کاویری سنگم پر... مہاراجہ کے محل کے سامنے... اُس کی بہت سی تصاویر میں شاکر نے اُس کے ساتھ پروفیسر کا عکس قید کر لیا تھا۔ ناہید کی پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔ وہ آہستہ سے بُدبُدائی... "تصویریں تو تم نے کھینچ لیں شاکر! لیکن ان چہروں پر کیا وہ مسکراہٹیں چپکا پاؤ گے جو پھول کی خوشبو کی طرح اُڑ گئی ہیں... شاید نہیں..."

OO

غلطی

کٹی پارٹی کی آخری ممبر رخصت ہورہی تھی کہ کشور آ گیا۔ معمول کے مطابق جھرنا سے حال چال پوچھا نہ ماں بابا کے کمرے میں گیا، نہ بچّوں سے ہنسا بولا۔ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر پڑ گیا۔

اگلے تین دنوں میں اُس کی شخصیت ہی بدل گئی۔ تمام وقت کچھ سوچتا رہتا۔ جھرنا پوچھتی تو کہہ دیتا ''مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔''

آٹھ دس روز کے بعد ایک دن آفس سے آتے ہی کہا: ''تیاّری کرلو۔ چند مہینوں کے لیے ہمیں یہ مکان خالی کرنا ہے۔ میں نے کرایے کا مکان دیکھ لیا ہے۔''

''ارے! مگر کیوں؟ کچھ بتاؤ تو!'' جھرنا حیرت سے بولی۔

''بس وہی میری غلطی... مطمئن رہو۔ جلد ہی سب کچھ جان جاؤ گی۔''

عام دِنوں میں کشور ایک مثالی شوہر، مثالی باپ اور مثالی بیٹا ثابت ہوا تھا۔ جھرنا کو یاد نہیں تھا کہ کبھی اس نے تیز آواز میں بات کی ہو۔ جھرنا کی ہر جائز خواہش پوری کرتا مگر ناجائز مانگوں کو اس خوبصورتی سے ٹالتا کہ وہ عش عش کرتی رہ جاتی۔ لاکھ چاہ کر بھی اپنی ضد پر اڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ جوہی اور گورو کی پیدائش کے بعد تو اُسے محسوس ہوتا کہ دُنیا میں اس سے زیادہ خوش نصیب عورت اور کوئی نہ ہوگی۔ جان نثار کرنے والا شوہر، خوبصورت ذہین بچےّ، مالی آسودگی، معاشرہ میں اُونچا مقام...وہ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔

بچےّ بھی ماں سے زیادہ کشور کے دیوانے تھے۔ ہر کام کے لیے اُس پر انحصار کرتے۔ کشور ہی ان کا ہوم ورک کرواتا، ان کے ساتھ کھیلتا، دوستوں کی طرح اُن کے مسائل اور

خوشیاں شیئر کرتا۔

کشور کے ماں بابا تھے گھر میں، ضعیف، کمزور اور بیمار۔ بس خاص ضروریات کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلتے پھر لوٹ کر اپنے اپنے بستروں پر پڑ جاتے۔ ماں کو گٹھیا نے مار رکھا تھا، بابا بلڈ پریشر اور شوگر کے مریض تھے۔ کشور ان کی تنہا اولاد تھا۔

سویرے آفس جانے سے پہلے کشور ماں بابا کے نہانے دھونے، کھانے پینے میں اُن کی مدد کرتا... کمرے کی صفائی کرتا... رات کو ان کے سونے تک ان کا خیال رکھتا۔

جھرنا کا جب بیاہ ہوا تھا تب ماں کی صحت اچھی تھی۔ بابا کا پورا خیال رکھتیں۔ جھرنا نے آتے ہی گھر پر قبضہ کرلیا۔ ان کے کھانے پینے، چائے پانی کی ذمہ داری بخوبی نبھاتی مگر اپنائیت نہ دِکھاتی۔ دوپہر میں اپنے کمرے میں بند ہو کر ناول پڑھتی یا ٹی وی دیکھتی... اُس کا یہ رُخ دیکھ کر کشور نے کبھی اُسے ماں بابا کی خدمت کے لیے مجبور نہیں کیا۔ شادی سے پہلے جیسے ان کی خدمت کرتا تھا، بدستور کرتا رہا۔ بابا کو پیشاب خطا ہو جانے کی شکایت ہوگئی تھی۔ اُن کے کپڑے دھونا، فرش اور کمرے کی صفائی کرنا اُسی کے ذمے تھا... اکثر اُس کی غیر موجودگی میں یہ ناگوار فرض جھرنا کو انجام دینا پڑتا اور وہ اُٹھتے بیٹھتے کشور پر احسان جتاتی رہتی۔ جوہی اور گورو کو وہ ان سے دُور ہی رکھتی تھی۔

نیا مکان کافی کشادہ تھا، اس میں ماں بابا کو جو کمرہ ملا اُس میں باتھ روم لیٹرین اٹیچڈ تھا جس پر جھرنا نے کافی اطمینان ظاہر کیا۔ ہر چند کہ اُسے دن رات ماں بابا کی خدمت نہیں کرنی پڑتی تھی مگر کشور کا انھیں بہت زیادہ وقت دینا بھی اُسے اکھرتا تھا۔

نئے مکان میں آنے کے سات مہینے بعد ماں گزر گئیں۔ بابا ان کی جدائی برداشت نہ کرسکے۔ اٹھارہ دِنوں بعد وہ بھی چل بسے۔ تیرہویں کی رسم کے بعد کشور نے کہا: ''چلو، اپنا گھر دیکھ آئیں۔ پھر شفٹ کرلیں گے۔''

کشور کی سنجیدگی سے جھرنا سہم گئی۔ اُسے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ کیا معاملہ سیٹل ہوگیا۔ خاموشی سے اُس کے ساتھ چل دی۔

ویسے اس مکان میں آنے کے بعد وہ پھر پہلے والا خوش مزاج کشور بن گیا تھا۔ بس مکان کی بات نکلنے پر صاف کہہ دیتا: ''ابھی کچھ نہ پوچھو۔ غلطی کی اصلاح کرلینے کے بعد ہم پھر اپنے

مکان میں واپس چلے جائیں گے۔''

پہلی ہی نظر میں جھرنا نے دیکھ لیا کہ مکان میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کچن کے ساتھ کا برآمدہ چھوٹا کر کے بچوں کے کمرے کے بازو میں ایک کمرہ بڑھا دیا گیا تھا جو مقفل تھا۔ ''یہ کب کیا؟'' جھرنا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''اسی کے لیے تو کرایے کے مکان میں شفٹ ہونا پڑا تھا'' کشور نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہ بچوں کا کمرہ تھوڑا چھوٹا کر دیا ہے... مہمانوں کا کمرہ جوں کا توں ہے۔ ہمارے بیڈروم میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔''

''اسے کھولیے۔ یہ کس کا کمرہ ہے؟'' جھرنا نے کہا۔

''یہ ہمارا کمرہ ہے۔''

''ہمارا بیڈروم تو وہ اُدھر ہے... ہم دو دو کمروں میں رہیں گے کیا؟'' جھرنا نے مسکرا کر کہا۔

''بیس سال بعد جب جوہی بیاہ کر سسرال چلی جائے گی اور گورو کی دُلہن آ جائے گی تب ہمیں اس کمرے کی ضرورت پڑے گی جھرنا۔'' کشور نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں... جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے... تم گٹھیا کے درد سے پریشان رات دن پلنگ پر پڑی رہو گی اور میں بیمار، کمزور ہو کر جانوروں کی طرح پیشاب کرتا چلوں گا... تب ہمیں اس کمرے کی ضرورت پڑے گی۔''

جھرنا کو جیسے سکتہ ہو گیا... کشور اُس کے چہرے پر اپنے جملے کا ردِّ عمل دیکھ رہا تھا۔ بہت دُکھی، بہت ٹوٹا ہوا نظر آیا وہ جھرنا کو۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

جب اُسے ہوش آیا تو دیکھا وہ پلنگ پر لیٹی ہے۔ کشور اُس کی ہتھیلیاں سہلا رہا ہے... اُس نے بے اختیار ہاتھ جوڑ دیے ''کشور، مجھے معاف کر دو۔''

''جھرنا، میں تمھیں الزام نہیں دیتا... غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ مکان بناتے وقت میں نے اپنے بیڈروم، ڈرائنگ روم، بچوں کے کمرے کا تو خیال رکھا، ماں بابا کے کمرے پر دھیان نہیں دیا۔ اپنے بیڈروم میں اے سی لگوایا، ماں بابا کے لیے ایک کولر کافی سمجھا۔ بچوں کے کمرے میں اُن کے کھلونوں، کاپیوں، کتابوں، کمپیوٹر، ٹی وی کے لیے جگہ بنائی، ماں بابا کے کمرے میں دو

پلنگ آ جائیں، بس اتنی جگہ رکھی۔ اپنے بیڈروم میں، مہمانوں کے کمرے میں ملحق باتھ روم لیٹرین بنایا، ماں بابا کے لیے یہ سہولت ضروری نہ سمجھی جبکہ ضعیفی اور بیماری کے سبب انھیں بار بار لیٹرین باتھ روم جانا پڑتا... اکثر فرش خراب ہو جاتا، کپڑے ناپاک ہو جاتے اور تمھیں نہ چاہتے ہوئے بھی صفائی کرنی پڑتی۔''

''کشور! مجھے معاف کردو۔''

''تم کیوں معافی مانگتی ہو۔ ماں بابا وہ میرے تھے۔ مجھے ان کا خیال رکھنا چاہیے تھا... یاد کرو، اُس روز کٹی پارٹی کے روز میں سر میں درد ہونے کی وجہ سے جلد لوٹ آیا تھا۔ تم مسز شرما کو رخصت کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں ''کیا کروں؟ ساس سسر کے مارے پریشان ہوں۔ ساسو جی پلنگ سے اُٹھ نہیں سکتیں۔ سسر جی سارا گھر گندہ کر دیتے ہیں۔ بار بار غسل خانہ جاتے ہیں... بیل کی طرح پیشاب کرتے ہوئے چلتے ہیں...''

جھرنا گم سم سُن رہی تھی۔ کشور نے نظریں جھکا کر کہا: ''تمھارا وہ جملہ تیر کی طرح میرے دِل میں ترازو ہو گیا... میں نے سوچا... بہت سوچا اور دوسرا مکان تلاش کیا، ایسا مکان جہاں ماں بابا ایک کمرے میں سہولت سے رہ سکیں... پھر ادھر اس مکان میں نئے کمرے کا اضافہ کیا... جھرنا، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بچوں کے لیے ماں باپ اپنا چین آرام سب کچھ تج دیتے ہیں تو بچے ان کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ افسوس، ماں بابا چلے گئے... ورنہ وہ دیکھتے کہ میں نے اپنے کمرے کی طرح، اپنے بچوں کے کمرے کی طرح ان کے لیے بھی آرام دہ کمرہ تیار کر دیا ہے۔ میں نے جو غلطی کی وہ اپنے بیٹے کو نہ کرنے دوں گا، مگر میرے دِل میں ایک کسک ہمیشہ رہے گی... تمھیں بابا کے لیے اتنا سخت جملہ نہیں کہنا چاہیے تھا جھرنا... نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑا۔

○○

دو حصّوں میں بٹا آدمی

وسیم جھنجلایا ہوا تھا۔ اُردو کی کانفرنس میں بھیجنے سے پرنسپل نے صاف انکار کر دیا تھا۔ دوسری طرف اس کی بیوی صنوبر کی ضد تھی کہ وہ تنہا سسرال جائے گی نہیں۔

پرنسپل کا اسے ڈیپوٹ نہ کرنا سمجھ میں آتا تھا، مگر صنوبر کی احمقانہ ضد اس کی سمجھ سے پرے تھی، پرنسپل کے نہ کہنے پر وہ اپنی عارضی چھٹیوں کا استعمال کر سکتا تھا مگر صنوبر کی اُلٹی کھوپڑی کو سیدھا کرنے میں اسے دانتوں پسینے آجاتے۔ تب بھی کامیابی کا امکان کم ہی تھا۔

مہانگر بمبئ میں یونیورسٹی اساتذہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، وسیم کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ حالانکہ وسیم یونیورسٹی میں ہندی ادب پڑھاتا تھا لیکن اُردو سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا: ''نثری ادب ہندی زبان کا بہتر ہے اور شعری ادب اُردو کا... اور ان کا مطالعہ اپنا شوق ہے۔''

وسیم اُردو میں تحقیقی کام کرنے کی سمت میں سوچ رہا تھا، کانفرنسوں میں جا کر اُردو محققین کی حالیہ رفتار سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا، پرنسپل سے کانفرنس میں جانے کے تعلق سے اس نے بات کی تو وہ بولے: ''ہمارے کالج میں اُردو سبجیکٹ پڑھایا نہیں جاتا ہے اس لیے اُردو اساتذہ کانفرنس سے تمھارا کیا مطلب؟''

''ابھی تو راست کوئی تعلق نہیں ہے، مگر تعلق اب میں استوار کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔

''پہیلیاں کیوں بجھاتے ہو؟ سیدھی سیدھی بات کرو۔'' پرنسپل نتھنے پھلا کر بولے تھے۔

''اُردو میری مادری زبان ہے، ہندی سے مجھے لگاؤ تھا۔ اس لیے ہندی میں ایم.اے کیا، ایم فل، پی.ایچ.ڈی وغیرہ ڈگریاں لیں، مگر اب میں اُردو کی طرف توجہ دینا چاہتا ہوں۔ آج اُردو جس نازک دَور سے گزر رہی ہے اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے اُردو والوں کا اُردو سے قطع

تعلق کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

''تو یوں کہو، کھاؤ گے ہندی کی اور خدمت کرو گے اُردو کی۔'' پرنسپل طنزیہ لہجے میں بول کر مسکرائے تھے... ''اور یہ لگاؤ، دلچسپی وغیرہ کیا بات کرتے ہو؟ یہ کیا تمھارا پیٹ بھر سکیں گے؟ حماقت نہ کرو، روزی روٹی کمانے میں جذباتیت کام نہیں آتی، اُردو میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے نٹھلے گھومتے ہیں، انھیں نوکری کہاں ملتی ہے؟ اسی لیے تو اُردو والے آج کل دوسری زبانوں اور دوسرے مضامین کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔''

وسیم تلملا گیا، چاہتا تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا، پرنسپل کے دلائل کا منہ توڑ جواب دے سکتا تھا، مگر مجبور تھا، لسانی مسئلہ آج جن تنگ نظر افراد کی وجہ سے خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے... پرنسپل اس کی بہترین مثال تھے، کسی کی کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتے۔ خود کی گنوار پوربی زبان بولنا چھوڑ چکے تھے اور انگریزی کے ثنا خواں بنے ہوئے تھے... مگر وہی حال تھا کہ کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا، خالص ہندوستانی ہی کہیں سے نہ لگتے تھے۔ انگریز دِکھائی دینا تو دُور کی بات ہے۔ رہی انگریزی بولنے کی بات تو یہ کون سی بڑی بات ہے! آج کل ہوٹل کے بیرے اور تفریحی مقامات پر دو دو پیسے کی چیزیں فروخت کرنے والے بھی انگریزی بول لیتے ہیں۔

انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی، انگریز بنانے کے لیے نہیں، اپنے قدموں تلے دبائے رکھنے کے لیے سکھائی تھی کہ انگریزی سیکھو، انگریزی میں اپنا مدّعا بیان کرو... انگریزی میں صاحب کو مکھن لگاؤ جس سے صاحب خوش ہو کر نظرِ عنایت کریں۔

انگریز نہ صرف قد آور اور سرخ سپید ہوتے ہیں بلکہ لباس کا انتخاب بھی اس طرح کرتے ہیں کہ مہذب دِکھائی دیں۔ بڑھے ہوئے پیٹ والے پدی ہندوستانی ڈھیلے ڈھالے پینٹ پہن کر اور انگریزی بول کر اپنے آپ کو انگریز سمجھنے لگیں تو ان کی ذہنیت پر رونا ہی آئے گا۔ درحقیقت رونا تو اس بات پر بھی آنا چاہیے کہ غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے چالیس برس بعد بھی ہم اپنی شناخت نہیں بنا پائے ہیں۔ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر ہمارے حکمرانوں کی چھاپ جوں کی توں بنی ہوئی ہے... ہم بجائے شرمندہ ہونے کے اس پر فخر محسوس کرتے ہیں، شان سمجھتے ہیں اس میں۔

پرنسپل سے مخاطب ہو کر یہ سب کہنا مناسب نہیں تھا اس لیے خون کے گھونٹ پی کر وسیم

خاموش رہا، دبی زبان سے اتنا ضرور کہا: ''میں بحث کرنا نہیں چاہتا، آپ اجازت دینے نہ دینے کے لیے آزاد ہیں، اگر آپ کانفرنس کے لیے مجھے ڈیپوٹ نہیں کر سکتے تو یونیورسٹی کا کوئی کام دے دیجیے، کام بھی کرلوں گا اور کانفرنس بھی اٹینڈ کر آؤں گا۔''

''ساری!'' پرنسپل نے خواہ مخواہ چشمہ اُتار کر اس کے شیشے صاف کیے اور نظریں چرا کر بولے: ''ڈیپوٹ کرنے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا، پھر چھاندے صاحب ابھی کل ہی واپس آئے ہیں، فی الحال تو کوئی کام نہیں۔''

وسیم اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ دل ہی دل میں پرنسپل کو ہزاروں صلواتیں سناتا ہوا گھر کی طرف چلا... پکّا بدمعاش ہے سالا! نہ جانے کس احمق نے اسے پرنسپل بنا دیا ہے۔ وہ بڈّھا اوتھی، وہ تِڑکے، وہ گیتے سب اس کے پٹّھو ہیں، اس کے تلوے چاٹتے رہتے ہیں، اسی لیے ان کو جہاں تہاں ڈیپوٹ کرتا رہتا ہے۔

تِڑکے فلاسفی پڑھاتا ہے مگر سوشیالوجی کی کانفرنس میں اگر کسی کو بھیجا جائے گا تو تڑکے کو بھیجا جائے گا۔ اوتھی دُنیا بھر کی اکزامنرشپ جوڑتوڑ کر کے حاصل کرتا ہے اور اسے ہر موقع پر ڈیوٹی لیو دی جاتی ہے، گیتے یہاں رہ کر ٹائم پاس کر رہا ہے، مہانگر کا رہنے والا ہے، وہاں ملازمت ملی نہیں تو ادھر آ گیا۔ اب جب بھی گھر والوں سے ملنا مقصود ہوتا ہے یونیورسٹی کا کام نکال لیتا ہے... کام بھی کیسے کہ سنے تو ہنسی آئے... کام کے نام پر بہانے!... پیمنٹ آنے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ فلاں کاغذ کا جواب کیوں نہیں آیا؟ ایک اہم دستاویز کا ریمائنڈر نہیں مل رہا ہے وغیرہ وغیرہ... کسی جگہ پلاٹ ارزاں قیمت پر دستیاب ہیں اور ایک پلاٹ خریدنے جانا ہے... یا لڑکے کی شادی کی بات چل رہی ہے، دکھوّے کو جانا ہے تو بھی یونیورسٹی کے کام کا بہانہ... کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کس کام کے لیے کون سا بہانہ کیا جائے گا۔ گیتے کو اپنے گھر جانا ہو تو یوں بھی جا سکتا ہے کہ سنا ہے پرسوں رجسٹرار صاحب کو چھینک آئی تھی... آج زکام تو نہیں ہو گیا؟ بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئر مین کی بٹیا کی نند کی ساس اسّی برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ پُرسے کو جانا ہے، بھلا یہ بھی کوئی دِن تھے اُن کے مرنے کے۔ ابھی انھوں نے دیکھا ہی کیا تھا... وغیرہ وغیرہ۔ یہ گیتے اگر لیڈر ہوتا تو سب کی چھٹی کر دیتا... ساری خصلتیں اس کی لیڈروں کی سی ہیں۔

اب کانفرنس کی بات لو، مراٹھی کا لکچرر سنسکرت کانفرنس میں جا سکتا ہے، انگریزی کا لکچرر

فرنچ زبان کی کانفرنس اٹینڈ کرنے کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ پبلک ایڈمنسٹریشن والا سوشیالوجی کی کانفرنس میں جا کر تیر مار سکتا ہے تو ہندی والا اُردو کی کانفرنس میں کیوں نہیں جا سکتا؟ یہ پرنسپل جب سے کرسی پر بیٹھا ہے اندھیر مچا رکھا ہے اس نے... لکچررس کو ایکسپلائیٹ کرتا ہے... خاتون لکچررس پر ڈورے ڈالتا ہے... ایک کو اُس نے خوب پٹا لیا ہے، تمام دن اپنے آفس میں بٹھائے رکھتا ہے۔ چپراسی اور کلرک کہتے ہیں کہ دونوں میں کچھ غلط سلط تعلقات ہیں... خواتین کے لیے ملازمت حاصل کرنے میں یہ قابلیت بھی مدِ نظر رکھی جاتی ہے... وہی ایڈیشنل کا کوالی فکیشن والی بات! بدانتظامی اور کرپشن کینسر کے جراثیم کی مانند دوسرے اداروں سے نکل کر تعلیمی اداروں تک پہنچ گئی ہے۔ اب اس ملک کا زوال قریب ہے، کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔

ان ہی سب خیالات میں غلطاں وسیم گھر پہنچا تو وہاں دوسری مصیبت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو یہ سوچ کر چلا تھا کہ صنوبر سے پرنسپل کے کمینے پن کا تذکرہ کر کے اس سے ہمدردی کے دو بول سنے گا۔ صنوبر نے صبر و تحمل سے اس کی روداد سنی بھی مگر اس کے خاموش ہوتے ہی تپاک سے بولی: ''کیا غلط کہا انھوں نے؟ اُردو کی کانفرنس اٹینڈ کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟ گنے چنے تین نمائندے آئیں گے اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچیں گے... نام وام تو کچھ ہوگا نہیں برخلاف اس کے اپنی جیب سے خرچ ہوگا... چھٹی جائے گی سو الگ...''

وسیم ہکا بکا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کیا بات کر رہی ہے صنوبر! کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہے جن کی بیویاں جاہل ہوتی ہیں وہ کیسے اُنھیں سمجھاتے ہوں گے کہ کانفرنس کیا ہوتی ہے اور کانفرنس اٹینڈ کرنے کے فوائد اور مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ صنوبر کیا خود نہیں سمجھ سکتی؟ اسے سمجھانا پڑے گا کہ کانفرنس اٹینڈ کرنے سے فائدہ ہی ہوتا ہے... نقصان تو ہو ہی نہیں سکتا۔

اسے اپنی بات پر کان نہ دھرتے دیکھ کر صنوبر نے کہا: ''آپ کے بھائی کی شادی بھی تو سر پر آ گئی ہے، آج ہی خط آیا ہے آپ کے گھر سے کہ ہم لوگ جلد پہنچ جائیں۔ اگر آپ تیرہ تاریخ سے سولہ تاریخ تک کانفرنس اٹینڈ کریں گے تو اٹھارہ تاریخ کو بھائی کی شادی میں گاؤں کیسے پہنچیں گے؟ آپ اپنی مرضی سے کانفرنس میں جا رہے ہیں مگر ادھر آپ کے گھر والے سمجھیں گے کہ میں نے آپ کو روک لیا۔ شادی کے انتظامات کے لیے نہیں پہنچنے دیا۔ اُن لوگوں کی تو

عادت ہے مجھے الزام دینے کی۔ آپ کے اقدام کی ذمہ دار میں ہی ٹھہرائی جاؤں گی۔''

''خاموش بھی رہو خدا کے لیے۔'' وسیم جھنجلا کر بولا۔ ''ذرا ذرا سی بات پر گڑے مردے اُکھاڑنے لگتی ہو۔ اور کانفرنس کے بارے میں نہ ہی بولو تو بہتر ہوگا۔ تم جاہل ہوتیں تو سمجھانے کی کوشش کرتا مگر تم جیسی تعلیم یافتہ جاہل سے سر پھوڑنا میرے بس کا نہیں... رہی شادی میں پہنچنے کی بات تو میں ہر حال میں اٹھارہ کو وہاں پہنچ جاؤں گا۔ تم اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے البتہ پہلے چلی جانا۔''

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں آپ کے گھر آپ کے ساتھ ہی جاتی ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں آتا وہاں جانے کا۔ آپ کی خاطر چلی جاتی ہوں۔ آپ کانفرنس سے لوٹ کر ادھر نہیں آئے تو شادی میں بھی آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی... پہلے جانا تو ناممکن ہے۔''

صنوبر کو وسیم کا طنز چوٹ پہنچا گیا تھا۔ اسی لیے اس پر ضد سوار ہوگئی تھی۔ وسیم الفاظ چبا چبا کر بولا: ''تم نے کبھی سسرال کو سسرال سمجھا ہے جو دیور کی شادی کے انتظامات میں ہاتھ بٹانے جاؤ گی۔'' آپ کا گھر، آپ کے بھائی، آپ کے گھر والے... یہ کوئی بات کرنے کا طریقہ ہے... تم دراصل یہ چاہتی ہو کہ مہمانوں کی طرح وہاں وقت پر پہنچو، تمھارا استقبال ہو، مگر اس ہوا میں نہ رہنا۔ ایسی ہیکڑی دِکھاؤ گی تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں وہاں۔''

''تو میں کون سی پرواہ کرتی ہوں ان کی۔ جوتی کی نوک پر مارتی ہوں سب کو۔ ہاں میرے میکے والوں سے بڑھ کر ہوتے تو خاطر میں لاتی۔'' صنوبر کا جواب تیار تھا۔

صنوبر سے اُلجھنا بے کار سمجھ وسیم اپنے کمرے میں آ گیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اسے شدت سے اپنے ٹوٹ کر بکھرنے کا احساس ہو رہا تھا... اسی طرح جیسے ضمیر صاحب ٹوٹتے ٹوٹتے اس انتہا کو پہنچ گئے تھے کہ دوسروں کا مکمل پن ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ شیشہ جب ٹوٹتا ہے تو آس پاس والوں کو زخمی کرتا ہی ہے۔

ضمیر صاحب کی یاد آئی تو پریشان خیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے ان کی یادوں کی طرف توجہ مرکوز کردی۔

وسیم ان دِنوں نیا نیا گریجویٹ ہوا تھا۔ ایم۔اے میں داخلہ لینے کا ارادہ تھا کہ اسی دوران اس کے والد پر فالج کا حملہ ہوا۔ وسیم کو مجبور ہو کر ایک اسکول میں عارضی ملازمت کرنی پڑی، وہ

جس اسکول میں ملازم ہوا تھا، ضمیر صاحب اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

ضمیر صاحب اس کے والد کے دوست تھے، گھنٹوں ان کے پاس آ کر بیٹھا کرتے، ان کی اگر کسی سے پٹری بیٹھتی تھی تو بس وسیم کے والد سے۔ بے حد تیکھا بولتے تھے وہ۔ کڑوا بولنے والا اگر یہ سوچے کہ چیونٹی جیسے چینی کو گھیرے رہتی ہے ویسے ہی دوست احباب اسے گھیرے رہیں تو یہ اس کی خام خیالی ہے، ضمیر صاحب کریلے بو کر جب کیلے نہ حاصل کر پاتے تو الزام ساری دُنیا کو دیتے۔

وسیم اکثر برافروختہ ہو کر اپنے والد سے کہتا تھا: ''آپ کیوں انھیں منہ لگاتے ہیں؟ میں نے آج تک ان کے منہ سے کسی کی تعریف نہیں سنی۔ ہر کسی کو گالی، ہر کسی پر لعنت ملامت! آپ انھیں سمجھاتے کیوں نہیں؟''

''اُس کی یہ عادت اس کے ساتھ قبر میں جائے گی، بچھو مرتے مرتے بھی ڈنک مار جاتا ہے۔ ضمیر کسی کے سمجھانے سے کچھ سمجھنے والا نہیں، عجب سنکی آدمی ہے، میں تو اسے دوحصّوں میں بٹا ہوا آدمی سمجھتا ہوں، گھر میں بیوی اس پر حاوی ہے۔ ایک نہیں چلنے دیتی اس کی۔ دو بیٹیاں ہیں وہ بھی باپ کی نہیں سنتیں۔ ماں کی شہ حاصل ہے انھیں، ادھر اسکول میں اس کی تلخ مزاجی سے سب نالاں ہیں۔''

جیسا کہ متوقع تھا ضمیر صاحب کی بڑی لڑکی کسی کے ساتھ فرار ہوگئی، بہت چرچے چل رہے تھے اس کے۔ وقت پر بند نہ باندھا جائے تو سیلاب تو آئے گا ہی۔ اور سیلاب آئے گا تو نقصان بھی یقینی ہے۔ ضمیر صاحب ذہنی طور پر بے حد مجروح ہوئے تھے۔ وسیم کے والد کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں روئے تھے۔ اضطراب اور جھنجلاہٹ کے عالم میں کبھی ساری دُنیا سے بدلہ لینے کی قسمیں کھائی تھیں تو کبھی خاندان کے تمام افراد کو زہر دے کر خود بھی اپنی زندگی ختم کر لینے کا قصد ظاہر کیا تھا۔ وسیم کے والد صاحب نے زندگی کی اُونچ نیچ اور دھوپ چھاؤں کی دُہائی دے کر انھیں اس ارادے سے باز رکھا تھا۔

ریٹائرمنٹ سے دو سال پہلے ہی ان کا پرموشن ہوا تھا۔ یہ وہی سال تھا جب وسیم کا تقرر ہوا تھا۔ چراغ جیسے بجھنے سے پہلے آخری بار زور سے بھڑکتا ہے بس اسی طرح ضمیر صاحب بھی ریٹائر ہونے سے پہلے سب کو خاک کر دینے پر تل گئے تھے۔ برگد کی طرح چھا گئے تھے اپنے

ماتحتوں پر۔ گن گن کر پرانے بدلے چکانے لگے تھے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سب کے سامنے ذلیل کرنا، ہر ایک کام میں مین میخ نکالنا، اسٹاف میٹنگ کے نام پر سب کے درمیان بیٹھ کر ڈینگیں ہانکنا ان کے معمولات میں داخل ہو گیا تھا۔ ان کے ماتحت ان کی غیر موجودگی میں کہتے: ''گھر میں ان کی بیوی ان پر حکم چلاتی ہے، یہ اسکول میں آ کر ہم پر نادر شاہی چلاتے ہیں، بیوی کی ناک میں نکیل ڈال کر بتائیں تو مرد کہلائیں۔''

وسیم سے خدا واسطے کا بیر ٹھان لیا تھا۔ وجہ کوئی خاص نہیں تھی بس وسیم کی قابلیت سے خار کھاتے تھے۔ اس کی حوصلہ شکنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اس کے ٹیچنگ نوٹس کو بلا وجہ سرخ روشنائی سے نشان زدہ کر دیتے۔ اس کی ٹیچنگ پر سخت اور خلاف ریمارکس دیتے، یہاں تک کہ اس کی سروس بک بھی خراب کر دی تھی۔ اساتذہ نے وسیم کے ساتھ ان کے رویے پر احتجاج کیا تو ان کی سروس بک خراب کر دینے کی دھمکی دے کر انھیں بھی خاموش کر دیا کرتے۔

ایک مرتبہ اپنے والد سے ضمیر صاحب کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے وسیم بے ساختہ کہہ گیا تھا: ''اس روز ضمیر صاحب خودکشی کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ آپ نے خواہ مخواہ انھیں باز رکھا۔ اس روز قصہ پاک ہو گیا ہوتا تو آج میرے پیچھے نہ پڑتے۔''

وسیم نے پوری سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔ وہ اتنا ہی دل گرفتہ تھا کہ ضمیر صاحب کا بُرا ہی سوچ سکتا تھا۔

وقت گزرا تو وسیم نے ایم۔اے کیا۔ ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ اسے پی۔ایچ۔ڈی ملے ہوئے دو تین دن ہوئے تھے کہ ایک دن ٹی وی پر رامائن سیریل دیکھتے ہوئے اسے ضمیر صاحب کی یاد آ گئی تھی، لنکا نریش راون جب اپنی پرجا سے رام کے ساتھ شری کا تخاطب سنتا ہے تو گرج کر کہتا ہے: ''رام کہو، شری مت کہو۔''

وسیم نے کھلکھلاتے ہوئے کہا تھا: ''ضمیر صاحب بے چارے خدا کو پیارے ہو گئے۔ اگر کہیں آج وہ زندہ ہوتے تو اور کوئی ان کی موجودگی میں مجھے ڈاکٹر وسیم کہہ کر پکار لیتا تو وہ بھی راون کی طرح چلا کر کہتے: ڈاکٹر مت کہو اُسے۔''

صنوبر کو بہت لطف آیا تھا اس لطیفے پر۔ صنوبر کا خیال آتے ہی وسیم کے خیالات کی رَو صنوبر کی طرف گھوم گئی... نہ جانے صنوبر آج تیتیا مرچ کیوں بنی ہوئی تھی؟ گھر کی چار دیواری میں

رہنے والی عورت کو باہر کے ماحول کے سرد وگرم ہونے کا اندازہ نہیں ہوتا... صنوبر سمجھتی ہے جس آسانی سے وہ گھریلو کام نپٹا لیتی ہے ویسے ہی وسیم اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتا ہوگا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی کہ گھر میں ہم اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ جب چاہا، جس طرح چاہا، کام کیا۔ نہ کیا تو کہنے والا نہیں... کام بگڑ جائے تو الزام دینے والا بھی سوچ سمجھ کر بولے مگر گھر کے باہر نکل کر روزی روٹی کمانے میں سر پر ایک تلوار ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے... افسر کی نگاہیں کسی تلوار سے کم نہیں ہوتیں... خاص طور پر اس وقت جب وہ اپنے منہ لگے خوشامدی ٹٹوؤں کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ عام طور پر تمام لوگ وسیم کی طرح جذباتی نہیں ہوتے۔ افسر کی ڈانٹ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں... نہ صرف ڈانٹ پھٹکار بلکہ احکام، ہدایتیں اور نصیحتیں بھی۔ وسیم جیسے تنکے کی مار نہ برداشت کرنے والے گھٹن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گھر آ کر شریکِ حیات سے ہمدردی کے بول سن کر ہی رات چین سے کاٹ پاتے ہیں، ورنہ تمام رات بے چینی سے گزرتی ہے۔ مگر گھاؤ پر مرہم لگانے کی بجائے نمک چھڑک دیا جائے؟ تب تو...

بتّی جلنے کا کھٹکا ہوا تو وسیم چونک گیا۔ آرام کرسی پر دراز وہ نہ جانے کب سے ماضی کی یادوں میں ڈوبتا اُبھرتا رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو جانے کی بھی اُسے خبر نہ ہوئی تھی... حالات مخالف نہ ہوں، زندگی وقت کی موجوں پر سکون سے رواں رہے تو کوئی بھلا ماضی کو کیوں یاد کرے؟ تب تو اُس کی آنکھ مستقبل کو بنانے، سنوارنے کے مقصد کی تکمیل پر مرکوز رہتی ہے۔

وہ خالی خالی نظروں سے صنوبر کو تکتا رہا، لائٹ اسی نے جلائی تھی۔ وسیم کو اپنی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا پایا تو نظریں چُرا کر بولی: ''کسی کے بھی کہنے سے آپ اپنا ارادہ ملتوی کر دیں گے کیا؟ آپ کو اگر محسوس ہوتا ہے کہ کانفرنس اٹینڈ کرنے سے آپ کو فائدہ ہوگا تو میری یا پرنسپل صاحب کے روکنے کی پرواہ کیوں کرتے ہیں؟ راہ کے روڑوں سے اٹک کر سفر ملتوی کر دینا کچھ مناسب تو نہیں۔''

صنوبر نے اس کی طرف پشت کر لی۔ میز پر کا سامان خواہ مخواہ اُلٹ پلٹ کرتی ہوئی اپنی صفائی میں بولی: ''مجھے کبھی کبھی نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ مگر آپ کیوں بحث کرنے لگتے ہیں؟ میں نے لیکن غلط کیا کہا؟ آپ کے نخرے بھی اُٹھاؤں میں، سسرال والوں کے طعنے بھی میں

سنوں؟ جب وہ لوگ بولنے پر آتے ہیں تو دیکھتے نہیں کہ میرا قصور کتنا ہے؟ میری کوئی بات آپ کے دل کو لگ گئی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔''

بہت پیار آیا وسیم کو صنوبر پر۔ بالکل ہی نادان ہے اب تک۔ زبان کی ضرور تیز ہے۔ مگر جتنی تیزی سے اسے غصہ چڑھتا ہے اُس سے کہیں زیادہ تیزی سے اُتر بھی جاتا ہے، میز پر کا سامان جو وہ خواہ مخواہ اُلٹ پلٹ کر رہی تھی اس کی یہ حرکت اس بات کا مظہر تھی کہ اس کا پارہ رفتہ رفتہ نیچے آ رہا ہے۔ یہ اس کی خاص ادا تھی، صنوبر کی چھوٹی بہن نے ایک مرتبہ وسیم کو بتایا تھا۔ 'ہمارے مکان کے کونے میں جب جالے لگ جاتے تھے، کتابوں کی الماریوں میں گرد جم جاتی تھی یعنی کہ جب بھی گھر کی صفائی کی ضرورت پیش آتی تھی تب ہم لوگ کسی طرح صنوبر باجی کو غصہ دلا دیا کرتے تھے۔'

وسیم کے حیرت سے وجہ دریافت کرنے پر اس نے وضاحت کی تھی: ''ہماری باجی کو جب بھی غصہ آتا ہے وہ گھر کی تمام چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر پٹختی ہیں۔ بس صفائی ہو جاتی ہے گھر کی۔ ہم لوگ تو اب اپنے گھر کی صفائی کے لیے کوئی دوسرا طریقہ اپنائیں گے۔ آپ چاہیں تو ہمارے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کر کے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔''

''نسخہ تو بعد میں آزمائیں گے پہلے اللہ کا شکر ادا کر لیں۔ ہم نے تو سن رکھا تھا کہ نک چڑھی اور غصہ ور بیویاں ہمیشہ گھر کی کراکری پر غصہ اُتارا کرتی ہیں۔''

یہ تو خیر دِل لگی کی بات تھی مگر صنوبر کے مزاج کا نفسیاتی تجزیہ کرنے پر وسیم نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ غصہ کی آخری حد تک پہنچ جانے کے بعد صنوبر کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو جاتی ہے۔ غالباً ان لمحوں میں وہ اپنے مزاج کا تجزیہ کرتی ہے اور اگر خود کو غلطی پر پاتی ہے تو فوراً غلطی کا اعتراف کر لیتی ہے۔

یہ بات بھی ابتدا میں وسیم کے مشاہدے میں آئی کہ صنوبر کی بات سے اختلاف نہ کیا جائے تو وہ غصہ آنے والی بات پر بھی غصہ نہیں کرتی۔ یہ شادی کے بعد کے دن تھے، اس لیے وسیم برابر خیال رکھتا رہا کہ کوئی بات صنوبر کے مزاج کے خلاف نہ ہو، مگر اس رمز سے بھی وہ خوب واقف تھا کہ مسلسل نرمی کرنے سے صنوبر اس پر حاوی ہو جائے گی... 'گربہ کشتن روزِ اوّل' کے مصداق وہ صنوبر پر پورا کنٹرول رکھنا چاہتا تھا کہ یہ کہاوت یہی سکھاتی ہے کہ بیوی کو ابتدا سے اپنے قابو

میں رکھو۔ اس طرح کہ وہ شوہر کی آواز سے آواز نہ بلند کرنے پائے، اس کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرے، اس کے جائز فیصلوں میں حارج نہ ہو، بیوی ایک مرتبہ شوہر پر حاوی ہوئی نہیں کہ شوہر کے گلے میں زندگی بھر کی غلامی کا طوق پڑا۔ اس کے برخلاف بیوی پر تھوڑا سا رعب جماؤ، مگر کبھی کبھی اس سے مات کھا جانے یا زیر ہو جانے کا ناٹک کرتے رہو تو وہ موم ہوتی جاتی ہے... پھر چاہے جیسا اسے بنالو... صنوبر یقیناً ایک بہترین شریکِ حیات ثابت ہوتی رہی ہے... وسیم ہی ذرا ذرا سی بات پر اسے غلط سمجھ بیٹھتا ہے، اب خواہ مخواہ اس بات کو لے کر اس کے تار ضمیر صاحب کی ازدواجی زندگی سے جوڑ بیٹھا۔

وسیم جو کچھ لمحوں قبل تک اپنے پرنسپل اور ضمیر صاحب کی باتوں کو یاد کر کے کڑھ رہا تھا۔ اپنے الگ الگ حصّوں میں بٹ جانے کے خوف سے لرزاں ہو رہا تھا۔ اب رفتہ رفتہ معمول پر آتا جا رہا تھا۔

OO

گُڈ نیوز

رگھو ویر رائے اپنے عالیشان بنگلے کے عالیشان آفس میں بیٹھے، بیٹے کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ ایش ٹرے سگریٹ کے اَدھ جلے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ تپائی پر بوتل اور گلاس رکھے تھے۔ وہ فلمی دُنیا کے انسان تھے۔ فلمی دُنیا جو متضاد مثالوں کی دُنیا ہے۔ یہاں مذہب، ذات پات اور فرقہ واریت کے نام پر اداکار ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹتے نظر نہیں آتے۔ پبلسٹی کے لیے، خبروں کی سرخیوں میں بنے رہنے کے لیے بھلے ہی ایک دوسرے پر چھینٹا کشی کر لیں، مصیبت کے وقت ایک ہو جاتے ہیں... اس انڈسٹری کا دوسرا رُخ اخلاقیات اور انسانی رشتوں کے تقدّس پر ایک بدنما داغ ہے۔ اخلاقی اقدار کہیں گم ہو گئے، اب تو عریانیت اور فحاشی ان کی پہچان ہے۔ باپ بیٹی پر فریفتہ نظر آتا ہے تو بھائی نیم عریاں کپڑوں میں ملبوس بہنوں کے ساتھ فخریہ گھومتے ہیں۔ ہیروئن لباس کی طرح عاشق بدلتی ہے، ہیرو ایک سے شادی کر کے نسل چلاتے ہیں، دوسری سے عشق فرماتے ہیں اور تیسری سے باکس آفس پر جوڑی بناتے ہیں۔ مائیں اپنی بیٹیوں کو سجا سنوار کر پروڈیوسرس کو پیش کرتی ہیں تو باپ اپنی بیٹیوں کی عریاں تصاویر پروڈیوسر کے سامنے رکھ کر اُسے للچاتا ہے۔ پھر ری مکس کے ذریعے جو بیہودگیاں پیش کی جا رہی ہیں، اُن سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہو گا۔

رگھو ویر رائے کی پیدائش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ اسی ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ اسی رنگ میں رنگ گئے۔ بیٹا جگدیپ بھی ماڈرن تہذیب کا دلدادہ تھا۔ رگھو ویر رائے نے ابتدا میں جو فلمیں بنائیں وہ یکے بعد دیگرے بُری طرح فلاپ ہو گئیں۔ وہ لگ بھگ دیوالیہ ہو گئے۔ اب اگر ان کی کوئی فلم کامیاب نہ ہوتی تو انھیں گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب جانا تھا۔ اسی لیے وہ ایسی فلم بنانے کے بارے میں سوچ رہے تھے جو نہ صرف پچھلا خسارہ پورا کر دے، بلکہ انھیں

کامیاب پروڈیوسر کے طور پر اسٹیبلش بھی کر دے۔

اسکرپٹ تیار تھی۔ لیڈی ٹارزن ٹائپ کی اس سستی تفریح مہیا کرانے والی اسکرپٹ پر وہ تین مہینوں سے کام کر رہے تھے۔ اس میں کامیابی کے تمام نسخے مار دھاڑ، آئٹم ڈانس، ریپ سین وغیرہ شامل تھے۔ مگر سب سے اہم کردار تھا درخت کے پتوں اور جانوروں کی کھال کے مختصر ترین لباس میں پیڑوں سے لٹکتی اور چھلانگیں لگاتی ہیروئن کا...اور ہیروئن ہی اب تک طے نہیں ہوئی تھی۔ یوں تو انڈسٹری میں ہیروئن بننے کے لیے گھروں سے بھاگ کر اور خوبصورتی کے مقابلوں میں جیت کر ماڈلنگ کے راستے سے فلمی دُنیا میں قدم رکھنے والی بہت سی لڑکیاں تھیں...پھر گزرے زمانے کے اداکار اور اداکاراؤں کی بیٹیوں کی لمبی قطار تھی مگر رگھوویر رائے ایسی ہیروئن چاہتے تھے جسے اداکاری چاہے نہ آتی ہو، کپڑے اُتارنا ضرور آتا ہو۔

جگدیپ رائے آیا تو اس کی صورت دیکھتے ہی وہ سمجھ گئے کہ ناکام لوٹا ہے۔ ایک جام بنا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے: ''پی لو۔ پھر اطمینان سے بتاؤ، کیا ہوا؟''

جگدیپ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے کہا: ''کہیں بات نہیں بنی ڈیڈ۔''

''کس کس سے ملے؟ ان تینوں میں سے کسی نے آفر قبول نہیں کیا جو خوفناک قتل، شعلہ بدن اور آدھی رات میں دھوم مچا چکی ہیں۔''

''نہیں۔ تینوں کہتی ہیں کہ اب وہ ایسی فلموں میں کام نہیں کریں گی۔''

''تو کیا ستی ساوتری کے رول کریں گی اب۔'' رگھوویر رائے نے زیرِ لب گالی بک کر کہا۔

''دراصل ان فلموں سے اتنا کما لیا ہے تینوں نے کہ سال دو سال آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی ہیں... تب تک تھو تھو کرنے والوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے اور وہ پھر ویسی ہی فلمیں سائن کر لیں گی۔''

''جو بھی ہو۔ نہیں مانیں وہ۔'' جگدیپ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا: ''آئٹم ڈانس کرنے والیوں کے دماغ ساتویں آسمان پر ہیں۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔ اسکرپٹ دیکھ کر ہاتھ جوڑ لیے۔''

''ستر چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ آئٹم ڈانس کے بعد کچھ بچا ہے دِکھانے کو جو انکار کر رہی ہیں۔'' رگھوویر رائے جل کر بولے۔

''ڈیڈ!'' جگدیپ اچانک بولا۔ ''کیوں نہ ہم اسکرپٹ میں کچھ تبدیلی کر لیں۔ لڑکیاں بدک رہی ہیں۔''

''تھان پر بندھنے سے پہلے گھوڑی بدکتی ہی ہے۔ اسکرپٹ میں تبدیلی نہیں ہوگی۔'' رگھوویر رائے نے سختی سے کہا۔''یہ نہ بھولو کہ ہمیں تین فلموں کا خسارہ پورا کرنا ہے۔ ہاں، تم زرینہ سے نہیں ملے۔ میں نے خاص طور سے اس کے لیے کہا تھا۔ فلموں میں یہ لہر اُن دونوں بہنوں ہی کی لائی ہوئی ہے۔ اسے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔''

جگدیپ نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا:''وہ راضی ہے لیکن...''

''کیا تمام بولڈ سین دے دے گی؟''

''بولڈ سے بھی بولڈ... یہاں تک کہ نیوڈ سین بھی۔ مگر ایک شرط ہے اُس کی۔ میڈیا یا خواتین کی انجمنوں کے اعتراض یا مقدمہ کرنے پر ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ وہ سین ایک ایکسٹرا لڑکی پر لیے گئے تھے... ڈیڈ۔'' اچانک کسی خیال کے آنے پر جگدیپ نے کہا:''ہم کسی ایکسٹرا لڑکی ہی کو کیوں نہ ہیروئن بنا دیں۔''

رگھوویر رائے نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا:''ایکسٹرا کے نام پر فلم بکے گی نہیں۔ زرینہ نمبر وَن کی دوڑ میں شامل ہیروئن ہے۔ ہر چند کہ اُس نے یہ شہرت اداکاری کے بل پر نہیں گلیمر کے بل پر حاصل کی ہے... تو اُسے سائننگ اماؤنٹ دے آئے؟''

''ڈیڈ! وہ بہت بڑی رقم کی ڈِمانڈ کر رہی ہے۔'' جگدیپ نے کہا۔

''وہ تو کرے گی ہی۔ کتنا مانگ رہی ہے؟''

''دس کروڑ۔''

رگھوویر رائے اُچھل پڑے۔''دس کروڑ! اتنا تو ہمارا پورا بجٹ نہیں ہے۔''

جگدیپ نیا سگریٹ سلگا کر طویل کش لیتا ہوا بولا:''کسی طرح کم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں آپ سے مشورہ کرنے کا کہہ کر لوٹ آیا۔''

''چھوڑو۔'' رگھوویر رائے نے کہا اور کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔ پھر جگدیپ نے کہا:''ڈیڈ! کچھ تو کرنا ہوگا۔ اس فلم سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ یقیناً ہی ہٹ ہوگی۔''

''اس میں شک نہیں۔ سامنے والا جو چاہتا ہے وہی اُسے پروسنا چاہیے۔ سادہ بھوجن تو سادہ بھوجن، پنچ پکوان تو پنچ پکوان... لیکن اگر گوبر گندگی مانگتا ہے تو وہی دینا ہوگا مگر سونے کی تھالی میں... اُروشی رمبھاؤں کے ذریعے... ہاں یاد آیا۔ کل تم سونیا کے ساتھ اسپتال گئے تھے، خیریت؟''

موضوع کے اچانک تبدیل ہو جانے سے جگدیپ چکرایا پھر سر جھٹک کر بولا: ''کچھ نہیں ڈائٹنگ کرتی ہے۔ چکر آنے لگے تھے۔''

''کوئی اور بات تو نہیں؟'' رگھوویر رائے نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''کوئی اور بات؟ نہیں۔'' جگدیپ جھینپ کر بولا ''فی الحال نہیں۔''

''تمھیں یقین ہے؟''

''ہنڈریڈ پرسینٹ...مگر...''

رگھوویر رائے اُس کی بات کاٹ کر بولے: ''میرا خیال ہے سونیا نے ایک ہی فلم میں کام کیا تھا کہ تم سے دوستی ہوئی اور تم دونوں نے شادی کر لی۔''

''ہاں!'' جگدیپ نے کچھ نہ سمجھ پانے کے انداز میں کہا۔ ''اُس فلم کی کامیابی کا نشہ آج تک نہیں اُترا ہے۔ محبّت کا وہ جنون وقتی تھا۔ آج بھی وہ ہیروئن بننے کے خواب دیکھتی ہے۔''

''تو کیا خیال ہے اُسے چانس دے دیا جائے۔'' رگھوویر رائے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' جگدیپ رائے بُری طرح چونک اُٹھا۔ ''کیسا چانس؟''

رگھوویر رائے جہاندیدہ آدمی تھے۔ جواب دینے کے بجائے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اُسے جلانے میں قصداً دیر کرنے لگے۔ کنکھیوں سے جگدیپ کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔

جگدیپ کا دماغ کمپیوٹر کی طرح سوچنے لگا...واقعی سونیا کو اگر مرکزی رول دے دیا جاتا ہے تو سارا ٹینشن ختم۔ کل سے شوٹنگ شروع کر کے ایک ماہ میں فلم مکمّل کی جا سکتی ہے...پھر ہوگی نوٹوں کی برسات۔ خسارہ پورا ہوگا۔ بینک بیلنس وسیع ہو جائے گا۔ سونیا ہاٹ اسٹار بن جائے گی۔

سگریٹ پھینک کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کیوں؟'' رگھوویر رائے نے بظاہر سگریٹ کی طرف متوجہ رہتے ہوئے پوچھا۔

''آپ گریٹ ہیں ڈیڈ!'' جگدیپ عقیدت سے بولا۔ ''میں ذرا سونیا کو گڈ نیوز دے آؤں، پھر آ کر بات کرتا ہوں۔''

OO

دو کوڑی کی عورت

دُنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں کئی قسم کے مرد اور کئی قسم کی عورتیں ہوں گی۔ ایمان داری سے کہوں تو میں نے صرف دو قسم کے مردوں کو جانا ہے۔ (عورتوں کو جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے خود کو تو سمجھ لوں!)

پہلی طرح کے مردوں میں شمار ہوتا ہے ڈاکٹر گورے، ناتھانی اور رِیاج کا۔

ڈاکٹر گورے ایم ڈی مقامی اسپتال میں آر.ایم.او ہیں۔

ناتھانی بزنس مین ہے۔

اور رِیاج (ریاض) امینہ کا مرد ہے۔

یہ تینوں مرد کی اُس ذات سے تعلّق رکھتے ہیں جو عورت کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ اُسے جسم کی بھوک مٹانے اور بچّہ پیدا کرنے کی مشین سمجھتی ہے۔ جس کے مطابق عورت کے اپنے جذبات، احساسات نہیں ہوتے، خواہشات نہیں ہوتیں، خواب نہیں ہوتے۔ جذبات، احساسات، خواہشات، خواب مردوں کے ہوتے ہیں جن کی تکمیل عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ جو یہ سمجھتی ہے کہ عورت کو محبّت کی، توجّہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عورت کو جسم کی بھوک نہیں ستاتی اور اگر ستاتی بھی ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُسے اپنی بھوک کو قابو میں رکھنا چاہیے... عورت کو صرف ایک مرد کو خوش کرنا آنا چاہیے اور یہ کوئی خاص مشکل نہیں۔ ایک سڑی سے سڑی عورت بھی یہ کر سکتی ہے۔ مگر مرد کی مردانگی ایک سے زیادہ عورتوں کو زیر کرنے میں ہے۔

ڈاکٹر گورے ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں اس لیے ان کا اور ان کی پتنی سریتا کا میرے یہاں آنا جانا ہے۔ ایک میں ہی ہوں جس کے سامنے سریتا اپنا دِل کھول کر رکھ دیتی ہے۔

ڈاکٹر نے سریتا سے محبّت کی شادی کی تھی۔ ڈاکٹروں کو اپنی اداؤں سے اپنے قابو میں رکھنا نرسیں اپنا پیدائشی حق مانتی ہیں تو ان کا استعمال (استحصال نہیں) کرنا ڈاکٹر اپنا فرض۔ سریتا تربیت یافتہ نرس تھی۔ ڈاکٹر گورے کے اسپتال میں تقرر ہوا اور وہ اس کے دِل و دماغ پر چھا گئی۔ باقاعدہ شادی ہوئی ہنی مون منایا گیا۔ پارٹی دی گئی۔ پارٹیاں کھائی گئیں۔ چار دِن کی چاندنی رہی پھر اندھیری رات آ گئی۔ سریتا کا ٹرانسفر ٹی بی اسپتال میں ہو گیا۔

ڈاکٹر اب اسی بات کے لیے سریتا کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے جس کے چلتے اس نے سریتا کو اپنی زندگی میں داخل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ آج اِس ڈاکٹر کے، تو کل اُس ڈاکٹر کے ساتھ اُس کا نام جوڑتا ہے۔ یہاں تک کہ کمپاؤنڈر، وارڈ بوائے کو بھی نہیں بخشتا۔ وہ مسلسل ذہنی کرب میں مبتلا رہتی ہے۔ زندگی اس کے لیے عذاب بن گئی ہے۔

ناتھانی، میرے شوہر کا بچپن کا دوست ہے۔ اس کی بیوی کامنی نے اسی لیے مجھے سہیلی بنایا ہے، ورنہ ہمارا اُن کا کیا جوڑ؟ وہ کروڑ پتی لوگ ہیں۔ ایک محل نما عمارت میں رہتے ہیں۔ ہائی سرکل میں موو کرتے ہیں۔

ناتھانی خوبصورت باوقار، مردانہ وجاہت کا شاہکار ہے مگر اندر سے نہایت گندا اور بیہودہ۔

اپنے شیریں لب و لہجے سے بزنس سرکل میں کافی مقبول ہے مگر کامنی سے مخاطب ہوتے وقت تو اُس کی زبان زہر ہی اُگلتی ہے۔

اُس کی خوش اخلاقی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ درحقیقت وہ ایک گھٹیا آدمی ہے۔

بیڈروم میں کامنی کے ساتھ جس طرح پیش آتا ہے اُسے کامنی دوسروں سے تو کیا، آئینے کے سامنے خود سے بھی نہیں کہہ سکتی۔ ذِلّت کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے۔ مجھے اشاروں میں کبھی بتانے کی کوشش کرتی ہے تو میں کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہوں۔

کامنی ایک باوفا بیوی ہے اس میں شک نہیں۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ بازارِ حسن کی پیداوار تھی مگر وہاں کی آلودگیوں سے وہ اتنی ہی دُور تھی جتنا کیچڑ سے کمل ہوتا ہے۔ ناتھانی نے جب اُس سے شادی کی تھی تب ان سب باتوں کا خیال نہیں کیا تھا۔ اس وقت تو کامنی کے عشق میں اندھا ہو رہا تھا۔ ماں باپ بھائی بہنوں کی مخالفت کے باوجود اُسے اپنا کر ہی دَم لیا

تھا... مگر اب اُسے 'ویشیا' پکار کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے کہ اُسے کسی خاندانی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے تھی۔ کامنی کے علم میں لا کر بازارو عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے... یہ گھٹیا پن نہیں تو اور کیا ہے!

کامنی سے اُس کا برتاؤ بالکل زرخرید لونڈیوں کا سا ہے۔ زرخرید تو وہ ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اپنی عزت کو ٹیوب لائٹ سے جگمگاتے کمرے میں، دوستوں کی محفل میں، جسم فروش عورتوں کے سامنے یہاں تک کہ گھریلو ملازمین کے سامنے بھی بے عزت کیا جائے۔

رِکشہ والا ریاج اسی قبیل کا تیسرا آدمی ہے۔ دِن بھر کی کمائی سے صرف اپنے پیٹ کا جہنم بھرتا ہے وہ بھی دارو سے۔ رات کو دارو اور اینہ کے بنا اس کا کام نہیں چلتا۔ نتیجہ صاف نظر آتا ہے۔ اُوپر تلے پانچ بچّے اور محتاجی ہی محتاجی! کھانے کی، کپڑے لتّے کی، خوشیوں کی، سکون کی، عزّت کی۔

میری ملازمہ چند دِنوں کے لیے چھٹّی پر گئی تو اینہ کو اپنی جگہ رکھ گئی۔ پہلے دن ہی کام کے دوران اُسے اُٹھتے بیٹھتے ہائے وائے کرتے دیکھا تو پوچھا میں نے ''طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟''

''نیند نہیں ہوئی رات کو۔ ریاج کی مہربانی۔'' وہ بولی۔

''ریاج کیا؟'' میں چکرائی۔

''میرے مرد کا نام ہے۔ رات بارہ بجے دو آدمیوں کو لے کر آیا۔''

''تو سو گئی ہوگی۔ اُٹھ کے کھانا بنانا جان پہ آیا ہوگا۔ ریاض نے مارا ہوگا۔''

اس طبقے کی عورتوں کے ساتھ عموماً یہی ہوتا ہے۔

''نہیں جی۔'' وہ رونے لگی۔ ''کیا کروں؟ میری قسمت ہی خراب ہے۔ بچّوں کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ نہ کروں تو اُن کا پیٹ کیسے بھروں؟ ریاج ایک اور وہ دو...''

میں شرم اور غصّے سے سرخ ہوگئی۔ ''بے شرم! توبہ کر توبہ! یہ لے پیسے آج کے اور نکل جا یہاں سے۔''

مجھے ڈر تھا کہیں میرے شوہر کے کانوں میں بھنک نہ پڑ جائے۔

اینہ پھر نہیں آئی۔ ایک روز اس کا لڑکا دوا کے لیے پیسے مانگنے آیا تو معلوم ہوا بیمار پڑی ہے۔ میں نے ڈاکٹر گورے سے اُسے دیکھ لینے کی درخواست کی۔ فیس بھی اپنے پاس سے دی

اور دوائیں بھی منگا کر دیں۔ اسی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے بہانے وہ جب تب میرے گھر آ جاتی اور ریاج کی زیادتیوں کا دُکھڑا سنا جاتی۔

امینہ خود تو کہیں نہ جاتی تھی۔ ریاض ہی گاہک پٹا کر لاتا، مگر اکثر ہی جب دارو اُسے پی جاتی تو چلاّ چلاّ کر سارے محلّے کو بتاتا کہ اُس کی عورت کیا کرتی ہے۔ لاچاری سے اپنا سینہ کوٹ کر امینہ اور اُس کے میکے والوں کو گالیاں دیتا۔ رِکشہ، تانگے والوں، مزدوروں کا محلّہ تھا، کوئی دھیان نہ دیتا۔

میں نے ان تین مردوں کو دیکھا، سنا، سمجھا تھا۔ چاہے وہ عزّت دار یا نچلے طبقے کے تھے، تعلیم یافتہ یا جاہل تھے اپنی اَنا کے شکار تھے۔

دوسری قسم کا مرد دوسری طرح کا ہے...ایک پرائمری اسکول کا ٹیچر۔ مناسب قد و قامت اور دلکش خدوخال ہیں۔ گردن پر اُتری ہوئی زلفیں اور گھنی کالی داڑھی اسے اور وجیہ بنا دیتی ہیں۔ سر پر ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح۔ وہ اندر باہر دونوں ایک جیسا ہے۔ کوئی لاگ لپیٹ نہیں۔

وہ اپنی بیوی سے بے حد پیار کرتا ہے۔ خوبصورت نازک گڑیا جیسی بیوی کو کانچ کے کھلونے کی طرح سنبھال کر رکھتا ہے۔ اُس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ زمانے کی خراب نگاہوں سے بچانے کے لیے سخت پردے میں رکھتا ہے۔ رات کو محبّت کا طالب ہوتا ہے تو ایسے جیسے وہ کوئی شہزادی ہو اور وہ ایک ادنیٰ غلام۔ محبّت کرتا ہے تو یوں جیسے کوئی پجاری دیوی کی پوجا کر رہا ہو۔

بس ایک بُرائی تھی۔ بہت زیادہ کتابیں پڑھ رکھی تھیں اُس نے۔ خصوصاً مذہبی کتابوں کا ہمہ وقت حوالہ دیتا رہتا۔ بار بار اُسے یاد دلاتا کہ خدا کے علاوہ اگر کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو مجازی خدا کو جائز ہوتا۔

بیوی کے لیے پل صراط پر چلنا شاید اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا اُس کی توقعات پر پورا اُترنا۔ کہیں نہ کہیں غلطی ہو ہی جاتی...کھانے میں نمک مرچ تیز ہونے پر، کھڑکی سے باہر جھانکنے پر، دوپٹہ کندھوں سے ڈھلک جانے پر، قہقہہ لگا کر ہنسنے پر وہ فوراً اُس تلوار کی یاد دلاتا جو اس کے سر پر ہمہ وقت لٹکی رہتی ہے، جسے زبان کی معمولی جنبش سے گرا کر وہ اس کے وجود کو زخمی کر سکتا ہے۔ اُس کے وجود کو ختم کر سکتا ہے۔

طلاق کی ننگی تلوار کے سایے میں زندگی گزارنا اتنا آسان تو نہیں، مگر وہ بچتی بچاتی شوہر کی

محبت کے سہارے زندگی گزار رہی ہے۔

ایک روز سریتا آئی ہوئی تھی۔ میں نے گیہوں کو دھوپ دِکھانے کا کام نکال لیا کہ باتیں بھی ہوں گی اور کام بھی ہوتا رہے گا۔ اتفاقاً کامنی بھی آگئی اور امینہ بھی۔ امینہ تو بیس روپے اُدھار مانگنے آئی تھی۔ مجھے کام میں لگا دیکھا تو ہاتھ بٹانے بیٹھ گئی۔

باتوں باتوں میں تینوں کا رونا شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر نے ایسا کہا، ویسا کہا۔ ناتھانی یہ بولا، وہ بولا۔ ریاج بیٹیوں کو بھی بُری راہ پر ڈالنا چاہتا ہے...

میں ہمیشہ خاموشی سے ان کی باتیں سن کر یہی صلاح دیا کرتی کہ صبر کرو۔ اللہ سے، بھگوان سے دُعا مانگو کہ تمھارے مردوں کو عقل دے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے...آج نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا ''تم لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتیں؟ آخر ظلم سہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

دھڑ سے دروازہ کھلا۔

سریتا، کامنی اور امینہ گھبرا کر کھڑی ہوگئیں۔

میں نے بھی لپک کر دُور پڑا دوپٹہ کھینچ کر سر پر اوڑھ لیا۔

ماسٹر جی سامنے کھڑے تھے۔

''دوکوڑی کی عورت! وہ برہم ہوکر چلاّئے۔'' مجازی خدا کے خلاف عورتوں کو بہکاتی ہے۔ میں تجھے طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔''

اور میں بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

○○

نیا دَور

پہلا پیریڈ ختم ہوا تھا اور کھورانہ بی.اے سال دوّم کی کلاس لے کر لوٹا تھا۔ یہ کلاس پرنسپل کے آفس والے کاریڈور میں تھی۔ کھورانہ آفس کے سامنے ہی سے ہو کر آیا تھا۔ وہ سب اسٹڈی روم میں بیٹھے تھے۔ اُن لوگوں کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے وہ اسسٹنٹ لائبریرین جارج کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جارج بھی شاید اسی مقصد سے وہاں کھڑا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے دونوں تاک جھانک کرتے رہے۔ کھورانہ جب سب کو اچھی طرح دیکھ چکا تو آگے بڑھ گیا۔

اسٹاف روم میں پہنچ کر اُس نے ڈسٹر اپنی میز پر رکھا، واش بیسن میں ہاتھ دھوئے پھر رومال سے ہاتھ خشک کرتا ہوا سین گپتا کی میز کے پاس پہنچا اور بائیں آنکھ دبا کر رازدارانہ انداز میں بولا: ''وہ بھی آئی ہے۔''

کہنے کا انداز رازدارانہ تھا۔ آواز اتنی بلند نہ تھی کہ سب سن لیتے۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

''کون، کون آئی ہے؟'' گپتا جی نے فوراً پوچھا۔

''وہی ودھوارانی۔''

''ودھوارانی!'' گپتا جی کچھ بجھ سے گئے۔ ''یہ کیسا نام ہے۔''

''آپ کیوں بجھ گئے؟ کیا آپ کو کسی اور کی آمد متوقع تھی؟'' کھورانہ نے اُنھیں چھیڑا۔

''کسی اور سے کیا مطلب؟'' بھالے راؤ تڑ سے بولا۔ ''سُمتی باکرے کی بات کر رہے ہیں گپتا جی؟... یار کھورانہ! گپتا جی کے دِل کی دہکتی آگ کو سُمتی باکرے کی موجودگی کی اطلاع دے کر شانت کر دے۔''

''سچ! وہ آئی ہے! میں تو اُدھر گیا تھا، نظر نہیں آئی۔'' گپتا جی کے چہرے پر رنگ آ گیا۔

''آئی ہے... آئی ہے۔ ابھی تو صرف انٹرویو کے لیے آئی ہے مگر مطمئن رہیے... اُسے اسٹاف میں بھی آیا ہی سمجھئے۔ سنا ہے انتظامیہ کے ہر ممبر کو سات سات ہزار دیے ہیں اُس نے۔'' کھورانہ نے کہا۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک سال کی پوری تنخواہ نذر کر دینے کا ایگریمنٹ ہوا ہے۔''

بھالے راؤ کی اس اطلاع پر ایک لمحے کے لیے سب حیرت زدہ رہ گئے۔

''پھر اُس کے گپتا جی جیسے گاڈ فادر بھی کم نہیں ہیں۔'' بھالے راؤ نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

''اُن کو بھی حقِ محنت ادا کیا جائے گا۔''

''اے دیکھو بھالے راؤ! اَنٹ شنٹ نہ بولو۔ میں کسی کا گاڈ فادر نہیں ہوں۔'' گپتا جی بگڑ کر بولے۔

کھورانہ ہنس کر بولا: ''فادر لفظ پر اُکھڑ گئے گپتا جی، بھئی اُن دونوں کے درمیان کے نازک رشتے پر 'فادر' لفظ سے بجلی نہ گراؤ بھالے راؤ۔''

''میرا کیا رشتہ ہے اُس سے؟'' گپتا جی بھڑک اُٹھے۔ ''تم لونڈوں کا دماغ خراب ہوا ہے۔ کسی سے ہمدردی جتاؤ تو اُلٹے سیدھے رشتے جوڑ لیتے ہو۔ سُمتی کو ملازمت کی سخت ضرورت ہے۔ مجھ سے وقتاً فوقتاً صلاح لیتی رہتی ہے۔ کبھی اُس کے خاندان والوں سے گہرے مراسم رہے ہیں۔ ان ہی تعلقات کو نبھا رہا ہوں۔ سیدھی سادی گھریلو ٹائپ لڑکی ہے۔ گائڈنس نہ ملنے پر گمراہ ہو سکتی ہے۔ ویسے وہ کوالیفائڈ ہے۔ اگر ہمارے کالج میں لگ جاتی ہے تو اچھا ہی ہے...''

''ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے گی۔'' بھالے راؤ نے ٹکڑا لگایا۔ گپتا جی اُسے گھور کر رہ گئے۔

''یہ سُمتی باکرے وہی تو نہیں ہے جو پہلے سینٹ فلومینا کانونٹ میں پڑھاتی تھی۔'' سنجے نارائن نے پوچھا۔ وہ اب تک ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سُن رہا تھا۔

''ہاں وہی ہے۔ پرائمری جماعتیں پڑھا کر پوسٹ گریجویشن کی جماعتوں کو پڑھانے کی اہل ہوئی ہے۔'' کھورانہ نے میٹھی چٹکی لی۔

''میری وائف وہاں پڑھاتی ہے۔'' سنجے نارائن نے کہا۔ ''وہ مجھ سے بتا رہی تھی کہ تین مرتبہ سُمتی کو وارننگ دی گئی تھی ٹیچنگ میں سدھار کرنے کے لیے۔ مگر اس نے مطلق دھیان نہ

دیا۔ آخر کار معطل کر دی گئی۔"

"بڑی زیادتی کی گئی بے چاری کے ساتھ۔ ہے نا گپتا جی!" کھورانہ نے طنز کیا۔ سنجے نارائن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔"یہ بات سراسر غلط ہے کہ اُسے ملازمت کی ضرورت ہے۔ سُمتی کے پتی بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں مگر سُمتی آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ طلاق کا مقدمہ چل رہا ہے۔"

"طلاق کے بعد پنچھی آزاد ہوگا اور ہوگا کھلا آسمان..." کھورانہ شرارت سے بولا۔

"اُس کے مہربانوں کی کمی نہیں۔" کھورانہ نے مہربان کہتے ہوئے گپتا جی کی طرف دیکھا تھا اور خوب چبا چبا کر یہ لفظ ادا کیا تھا۔

گپتا جی مشتعل ہو کر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بھالے راؤ جلدی سے بولا:"ارے نہیں گپتا جی، آپ سے مخاطب نہیں ہے وہ۔ اپنے پرنسپل ہیں پردے کے پیچھے، اُس کے پی۔ایچ۔ڈی کے گائڈ ہیں، انتظامیہ کے ایک ممبر ہیں۔ اِن سب کی نظرِ کرم شاملِ حال رہی تو سُمتی با کرے رانی جیسا راج کرے گی کالج میں۔"

"رانی کہا تم نے تو یاد آیا... یہ ودھوا رانی کون ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا؟" گپتا جی نے بات آئی گئی کرنے کو کھورانہ سے پوچھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ان نوجوانوں سے وہ پار نہیں پا سکیں گے۔

"وِبھا پانڈے کو نہیں جانتے آپ؟" کھورانہ بولا۔

"مگر تم نے وِبھا پانڈے کب کہا تھا؟" گپتا جی ترکی بہ ترکی بولے۔"اس نے خود ہی شادی کے بعد نام بدلا ہے یا تم لوگوں نے یہ نام دیا ہے اُسے؟"

"جب سے وہ بیوہ یعنی وِدھوا ہوئی ہے تب سے ہم لوگوں نے اُسے یہ نام عطا کیا ہے۔" کھورانہ شان سے بولا۔ پھر سین گپتا اور بھالے راؤ کی طرف دیکھ کر بولا۔"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ وِبھا نے اُس بڈّھے سے شادی کیوں کی تھی۔ معلوم تو تھا اُسے کہ بڈّھا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ زیادہ دِن تک اُسے سہاگن نہ رہنے دے گا۔"

بھالے راؤ نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا:"قبر میں پاؤں ضرور لٹکے تھے مگر پونجی پتی بھی تو تھا۔"

سین گپتا نے بزرگانہ انداز میں کہا:"کھورانہ، کبھی کبھی تم بیوقوفوں جیسی بات کرتے ہو۔

سُمتی اور وِبھا جیسی لڑکیاں گرہستی بسانے کے لیے نہیں پیدا ہوتیں۔ وہ کسی ایک شخص پر انحصار کر سکتی ہیں نہ مرد کی اجارہ داری برداشت کر سکتی ہیں۔ ظاہر ہے جو مرد انھیں زوجیت میں قبول کرے گا وہ انھیں کھُل کھیلنے کے لیے آزاد تو نہیں چھوڑ دے گا؟ سمتی اور وِبھا دونوں نے اسی کالج میں تعلیم پائی ہے۔ ہم لوگ اُن کی آزاد فطرت سے خوب واقف ہیں۔ استادوں سے ہنسی دل لگی کر کے سہولتیں حاصل کرنے میں ماہر تھیں دونوں۔ سُمتی باکرے تو ایک لکچرر کے اتنے قریب ہوگئی تھی کہ اُس کی ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ اس لکچرر کی پتنی نے ایک دن کالج میں آ کر سُمتی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ تب کہیں جا کر سُمتی نے پیچھا چھوڑا۔ شادی کی، تو تین برسوں کے بعد ہی پتی سے الگ رہنے لگی۔ اب کوئی بھاؤ جی ہے تو کوئی کا کا جی... کوئی منہ بولا بھائی ہے تو کوئی فیملی فرینڈ۔ جس کانونٹ میں پہلے پڑھاتی تھی وہاں کا ایک کلرک دن رات اُس کے گھر میں پڑا رہتا ہے۔''

ندیم پٹھان اس کالج میں نئے نئے ٹرانسفر ہو کر آئے تھے۔ وہ کافی دیر سے فائلوں میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ مطلوبہ کاغذ مل جانے پر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہنس کر بولے: ''بھائی سین گپتا، یہاں جو باتیں چل رہی ہیں انھیں سن کر ہرگز یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی کالج کا اسٹاف روم ہے۔ یہاں پر تو چوراہے کے پان ٹھیلے کا گمان ہوتا ہے، جہاں راستے سے گزرتی کسی مشکوک چال چلن والی عورت پر آوازے کسے جا رہے ہوں۔ آخر ہم لوگ درس و تدریس کے معزز پیشے سے منسلک اشخاص ہیں۔ رکشا تانگہ چلانے والے یا غنڈے اُٹھائی گیرے تو نہیں ہیں۔''

سین گپتا اور پٹھان گہرے دوست تھے اس لیے سین گپتا نے اس بات کو مذاق میں ہی لیا۔ کوئی دوسرا انھیں اس طرح کھری کھری نہیں سنا سکتا تھا۔ پٹھان بھی سین گپتا کے سوا اور کسی کو یوں نہ لتاڑتے۔ سین گپتا لاپرواہی سے شانے اُچکا کر بولے: ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔ میاں کل کو وہ تمھاری کولیگ بنیں گی، تب تم سے آٹے دال کا بھاؤ پوچھیں گے۔ اُس وقت ہمارے سامنے ہاتھ جوڑو گے کہ معلوم تھا تو پہلے آگاہ کیوں نہ کیا؟''

''مگر اُن کا سلیکشن ہوگا ہی، یہ تم کس یقین سے کہہ رہے ہو۔ انٹرویو دینا منتخب ہو جانا نہیں ہے۔'' ندیم پٹھان نے کہا۔

''مجھے پتہ ہے کہ کس کا سلیکشن ہوگا اور کس کا نہیں ہوگا۔لکھ لو، ایک نام بھی کم ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ وِبھا پانڈے اور سُمتی باکرے کا سلیکشن صدفی صد یقینی ہے۔ یہ دونوں پبلک پراپرٹی ہیں اور ہمارے کالج میں آجانے سے اُن کے جملہ حقوق ہمارے کالج کے نام محفوظ ہو جائیں گے۔ نیلما دیشمکھ انسٹی ٹیوٹ کے پریذیڈنٹ کی سالی کی نند ہے اس لیے اس کا بھی تقرر ضرور ہوگا۔ کملیش ریزرویشن کوٹے میں آئے گی... یوں کوٹے میں اور بھی اُمیدوار ہیں اور کملیش سے زیادہ کوالیفائڈ ہیں مگر کملیش نے رشوت کھلائی ہے۔''

''ارے! سب دیویاں ہی بھری جارہی ہیں کیا اس بار؟'' ترویدی جی بُراسا منہ بنا کر بولے: ''انھیں عورتوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔''

''اب آگے بھی دیویاں ہی لی جائیں گی پنڈت جی۔ تنک اپنے کو بچا کر رکھیے۔'' کھورانہ نے کہا تو ایک قہقہہ پڑا۔

سین گپتا منہ بچکا کر بولے: ''وہ زمانہ گیا پنڈت جی جب معزز خاندانوں کی لڑکیاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ وہ اپنے کو لیے دیئے رہتی تھیں۔ ہر کسی کی تفریح کا ذریعہ نہیں بنتی تھیں۔ اب اس طرح کی شرمیلی لڑکیوں کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا... ویسے ایک مثبت پہلو بھی ہے اس بات کا۔ کھورانہ جیسے لکچررز سے بہتر تو یہ دیویاں ہی ہوتی ہیں جو چاہے دُنیا بھر کے دھندے کرلیں مگر تھوڑا بہت پڑھا بھی لیتی ہیں۔''

پھر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ کھورانہ ڈھیٹ تھا، خود بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

کھورانہ مدھیہ پردیش سے دو سال قبل مہاراشٹر میں آیا تھا۔ ایک نمبر کا چالباز اور چلتا پرزہ تھا۔ تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دیا تھا سب کو۔ آیا تھا عارضی طور پر، کلاس میں پڑھاتا خاک نہیں تھا۔ طلبا کو ان دِنوں کے قصے سنایا کرتا جب وہ اسٹوڈنٹ یونین کا صدر تھا۔ کس کس طرح سے اس نے اسٹاف کا ناطقہ بند کیا تھا اور کس کس طرح اپنی مانگیں پوری کروائی تھیں۔

پرنسپل نے نوٹ کیا تو ایک روز کہا: ''مسٹر کھورانہ! کچھ پڑھایا بھی کرو۔''

''کیا پڑھاؤں؟ کیوں پڑھاؤں؟ عارضی ملازمت دی ہے آپ نے۔ کیا جانیں کب نکال دیں مجھے۔ کیوں اتنی محنت کروں!''

چند ماہ بعد اُسے مستقل کرلیا گیا مگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔

پڑھانا وڑھانا خاک نہیں بس اِدھر اُدھر کی ہانکنا۔ پرنسپل نے ٹوکا۔ ''بھئی اب تو پڑھاؤ۔ اب تو ملازمت سے نکالے جانے کا اندیشہ نہیں رہا۔''

''سلیکشن بورڈ کے ذریعے تقرر ہوا ہے میرا۔ پڑھاؤں، نہ پڑھاؤں، اب کون نکال سکتا ہے مجھے۔'' کھورانہ کا جواب تھا۔

پھر وہ مُرینا کا کھورانہ مشہور ہو گیا۔ سین گپتا اور بھالے راؤ اس کے دوست بن گئے۔ پورے کالج کو مٹھی میں کر لیا اس تگڑی نے۔

اسی وقت سُمتی باکرے اور وِبھا پانڈے اسٹاف روم میں داخل ہوئیں۔ کھورانہ نے سین گپتا کی طرف دیکھ کر بائیں آنکھ دبائی، پھر لپک کر اُن دونوں کی طرف بڑھا۔

''آیئے، تشریف لایئے مستقبل کی پروفیسر صاحبان، سواگت ہے آپ کا۔''

''سچ! سچ کہا آپ نے؟'' سُمتی نے اِٹھلا کر کہا۔ ''کیا واقعی ہمارا سلیکشن ہو گیا؟''

''آپ کے منہ میں گھی شکر!'' وِبھا نے بھی کھورانہ کی طرف دلکش مسکراہٹ پھینکی ''مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ ابھی ابھی تو انٹرویو ختم ہوئے ہیں۔''

''مجھے تو اس وقت سے معلوم ہے جب آپ لوگوں نے درخواستیں بھی نہیں دی تھیں۔ میں اپنے آس پاس کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتا ہوں۔''

وِبھا پانڈے اس کے طنز کو سمجھ گئی۔ موقع کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہی ترویدی جی اور گپتا جی کو نمسکار کر کے وہاں سے کھسک گئی۔ سُمتی بھی اس کے پیچھے ہولی۔

چپراسی چائے لے آیا تھا۔ سبھی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ چپراسی چلا گیا تو سنجے نارائن بولا: ''آج کل ہر شخص بکاؤ ہو گیا ہے ہر چیز بکنے لگی ہے۔ عالم بھی اپنے علم کا سودا کرنے لگے ہیں۔ سلیکشن کمیٹی میں جو ماہرین آتے ہیں وہ کیوں انتظامیہ کے دباؤ میں آ کر نااہل کا تقرر کر دیتے ہیں؟ میرے ایک دوست کا بھتیجا ہے، پی. ایچ. ڈی ہے۔ اس نے بھی اپلائی کیا تھا، مگر جب اسے معلوم ہوا کہ کس کا تقرر ہونا ہے، یہ پہلے ہی طے ہو گیا ہے، تو وہ انٹرویو میں آیا ہی نہیں۔''

''پرانی بات ہو گئی ہے یہ۔'' کھورانہ نے تلخی سے کہا۔ ''ویسے اس موضوع پر کوئی کہانی لکھنے کا ارادہ ہو مسٹر سنجے نارائن تو تھوڑا مسالہ مجھ سے اور لیجیے۔ چٹپٹی کہانی بنے گی۔ آج پی. ایچ. ڈی

کوئی اہم ڈگری نہیں رہ گئی۔ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اسے حاصل کر سکتا ہے، جیسے مکمل شراب بندی کے دِنوں میں بھی مخصوص دُکانوں پر کھلے عام شراب بکتی ہے۔ بس دُکان کا پتہ ہونا چاہیے۔ ویسے ہی اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ کون سا ڈاکٹر ڈگریاں دلوا رہا ہے۔ اس کے پاس پہنچے، رجسٹریشن کرایا، ۲۰-۳۰ ہزار ہاتھ پر رکھے اور گھر آ کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ڈیڑھ سال بعد جاگے اور دوبارہ پہنچے اس کے پاس۔ تھیسس آپ کے حوالے۔ ٹائپ کراؤ، جلد بندھاؤ، یونیورسٹی میں جمع کراؤ اور ڈگری لے لو۔ ریفری کا تقرّر بھی آپسی معاہدے کے تحت ہو جاتا ہے۔ تم میرے اسٹوڈنٹ کی پی. ایچ. ڈی نکال دو، میں تمھارے اسٹوڈنٹ کو ہری جھنڈی دِکھا دوں گا۔''

کھورانہ کی تلخ باتیں دِل کو لگ رہی تھیں۔ سب خاموشی سے بیٹھے رہے۔ کھورانہ پھر بولا:

''اُس شمتی با کرے ہی کو لو۔ انگریزی کے پانچ جملے صحیح نہیں لکھ سکتی، مگر پانچ سو صفحات کی تھیسس جمع کی ہے۔ اُس نے آگرے سے برآمد شدہ ریڈی میڈ تھیسس۔ بھلا پوچھو کہ لائبریری کی صورت دیکھی کبھی؟ کبھی ریڈنگ روم میں قدم رکھا؟ کبھی نہیں۔ کبھی کتابوں کو کھول کر دیکھا؟ قسم کھا لے گی کہ ایسی غلطی کبھی نہیں کی۔ ان سب فضولیات میں وقت ضائع کرنے کی فرصت کسے تھی۔ پی. ایچ. ڈی کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ نئے دَور کے ساتھ خود کو تبدیل کر لے اور...''

اچانک پرنسپل کو اسٹاف روم میں داخل ہوتا دیکھ کر کھورانہ نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر پرنسپل بولے: ''اوہ! تو آپ لوگ چائے پی چکے۔ میرے لیے ایک کپ منگوایئے۔ بھئی تھک گیا ہوں میں۔ سترہ اُمیدواروں کا انٹرویو لینا تھکا گیا مجھے۔ ہاں! آپ لوگوں کے لیے خوشخبری ہے۔ چار لکچررز کا سلیکشن کر لیا ہے ہم نے۔ پانچویں کا تقرر فی الحال نہیں ہوگا۔ اب پھر سے پوسٹ ایڈورٹائز کرنی پڑے گی۔ درخواستیں آئیں گی، پھر انٹرویو لینا پڑے گا... ہاری بل!''

کوئی کچھ نہ بولا۔ شاید سب یہی سوچ رہے تھے کہ کس طرح کے کوالیفائڈ شخص کی تلاش تھی انھیں؟ کیا معیار ہے اہلیت کا؟ پبلک پراپرٹی بننے کی صلاحیت! رشوت دینے کی حیثیت! وی. آئی. پی سے رشتے داری کا ثبوت! بھلا جن کو ان باتوں کا علم ہی نہ ہو وہ انٹرویو میں کامیاب ہو تو کیسے ہو؟

○○

شارٹ کٹ

شام سے جو شروع ہوئی تھی تو رات بھر ہوتی رہی تھی برسات! کڑاکے کی ٹھنڈ بھی تھی۔ سورج کب طلوع ہوا پتہ ہی نہیں چلا۔ یامنی کی آنکھیں کھلیں اُس وقت ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ اُس نے برش کر کے غسل کیا اور چلنے کی تیاّری شروع کر دی۔ بالکنی میں دھوپ کی ایک پتلی سی لکیر ڈرتے ڈرتے داخل ہو رہی تھی... اسی کے سہارے یامنی نے بال بنائے۔ بنانے ونانے کیا تھے، بس یوں ہی سمیٹ کر جوڑے کی شکل دینی اور پنیں لگانی تھیں۔ جب وہ جوان تھی تب بھی کبھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے خود کو گھنٹوں دیکھا، یا سنوارا ہو اُسے یاد نہیں۔ آئینے سے کبھی اُس کی دوستی ہوئی ہی نہیں۔ ہوتی بھی کیسے؟ مینڈھے کے بالوں جیسے گھنگرالے سخت بال اور سامنے کے دو دانتوں میں خلا اُسے احساسِ کمتری میں مبتلا رکھنے کو بہت تھے۔ جوان ہوتے ہی کنواری لڑکیوں کے خوابوں میں گھوڑے دوڑاتے راج کمار، جانباز شہزادے، سجیلے بانکے، پُر وقار اعلیٰ عہدے پر فائز نوجوان آنے لگتے ہیں مگر یامنی کے خواب سب سے الگ ہوتے۔ وہ خواب دیکھتی کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اُتر کر اُسے انار دانے جیسے چمکدار دانتوں کا عطیہ دے گیا ہے۔ خوبصورتی کی دیوی اُس کے چھوٹے گھنگھرالے بالوں کو بادلوں کی سیاہ رنگت اور دھامن سانپ جیسی لمبائی دے گئی ہے۔ دانتوں اور بالوں کے سبب عجب کامپلیکس میں مبتلا ہو گئی تھی یامنی۔ ماں کی گود میں سر چھپا کر روتی تو ماں سمجھاتی: ''یامی، سامنے کے دانتوں میں خلا اور چہرے کی بائیں طرف تل خوش قسمتی کی نشانیاں ہیں تو دل کیوں چھوٹا کرتی ہے؟''

دونوں نشانیاں آج بھی ہیں مگر بے نشان! بے فائدہ، بے کار، بے اثر... ریت کا ایک صحرا ہے اس کی زندگی، جس میں کبھی خوشی نے قدم رکھا بھی تو سراب کی طرح... اس سراب کے پیچھے

بھاگتی بھاگتی وہ عمر کے چالیس پڑاؤ طے کرگئی ہے۔

بہت چھوٹی تھی وہ، تب کی بات ہے۔ مَوساجی اُس کا ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ وہ معصوم تھی اس لیے ان کی باتوں کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ مگر جنھیں سمجھنا چاہیے تھا وہ سن کر بھی انجان بن گئے۔ مَوساجی کا قول، اُن کا کہا سچ ہوا۔ اس کی زندگی، جدّو جہد کی ہم معنی بن کر رہ گئی ہے۔

اُس کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھتے ہی موساجی گمبھیر ہو گئے تھے۔ بے اختیار اُن کے منہ سے نکلا تھا: ''اُف! کس قدر سنگھرش ہے اس لڑکی کے جیون میں!'' بابا اور ماں کا دھیان موساجی کے الفاظ پر نہیں گیا۔ وہ تو اپنے لاڈلے بیٹے پریش کے بارے میں یہ سن کر سکتہ زدہ بیٹھے تھے کہ وہ محبت کی شادی کرے گا۔ پریش تو ہنس کر یہ کہتا ہوا چلا گیا تھا کہ 'اچھا ہے نا، آپ لوگ لڑکی ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ جائیں گے' مگر ماں، بابا کتنی ہی دیر تک معمول پر نہیں آسکے تھے۔

یامنی نے خود کا نظر انداز کیا جانا محسوس کیا تھا اور اس احساس سے پیچھا چھڑانے کے لیے منہ ہی منہ میں بد بدائی تھی: ''ہوئے نا سنگھرش! میں کیا سنگھرش سے ڈرتی ہوں۔ موساجی، آپ میری تعلیم، میرے کیریئر کے بارے میں بتائیے۔''

ہوا کا رُخ دیکھ کر موساجی نے موضوع بدل دیا تھا۔ ''بہت اُونچی تعلیم حاصل کرے گی تُو۔ ہمالہ جیسی شہرت تیرے نصیب میں ہے۔ دیکھ! خود دیکھ لے۔ تعلیم کی ریکھا کتنی واضح، کتنی لمبی ہے۔ خوشحالی بھی زندگی بھر تیری خادمہ رہے گی۔''

دستک کی آواز سے وہ چونک گئی۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ بہادر چائے لے کر آیا تھا۔ چائے پی کر یامنی تیّار ہوئی۔ نوٹ بک اُٹھائی، پرس لیا۔ باہر نکل کر دروازے کو قفل لگایا اور بغل کے دروازے پر دستک دی۔ ہرشا نے دروازہ کھولا۔ یامنی کو تیّار دیکھ کر حیرت سے بولی: ''دیدی! پورا ایک گھنٹہ ہے ابھی۔ اتنی جلدی نکل پڑیں؟''

''میں پیدل نکل رہی ہوں۔ سویرے کی ٹھنڈی ہوا کا نشہ ہی الگ ہے۔ میں اس نشے کی عادی ہوں۔ تمھیں اپنے نکلنے کی اطلاع دینے آئی ہوں۔ تم اپنی سہولت سے آؤ۔''

روما ابھی تک بستر میں تھی۔ جھپٹ کر اُٹھی۔ رسّی پر سے تولیہ اور دوسرے کپڑے کھینچ کر یامنی کے سامنے کھڑی ہو کر بولی: ''او ماں! میں نے تو ابھی تک اشنان بھی نہیں کیا۔ دیدی! یو آر گریٹ! آپ چلیں، ہم رِکشہ سے آجائیں گے۔ ہے بھگوان! یہاں کی ٹھنڈ سے جانے کب

ہماری پٹری بیٹھے گی؟''

''بیٹھ ہی جائے گی کبھی نہ کبھی'' یامنی نے ہنس کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔ روما ہمیشہ نان اسٹاپ بولتی ہے۔ ویسے کھلے دِل کی ہے۔ دل میں میل نہیں رکھتی۔

ہوسٹل کے گیٹ پر پہنچی تھی کہ اُوپر کی منزل سے کسی نے پکارا۔ یامنی نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اشوک موہنتی تھا۔ بولا: ''دیدی! تم چل بھی دیں۔ میں تو ابھی سو کر اُٹھا ہوں۔ ابھی اشنان کرنا ہے۔ بریک فاسٹ لینا ہے۔ یو آر گریٹ دیدی! ہم نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہو تم!''

''وقت پر پہنچ جانا'' یامنی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''باتیں پھر ہوں گی۔''

یونیورسٹی کیمپس وسیع و عریض تھا۔ لکچررس کے کوارٹر، طلبا، طالبات کے علیحدہ علیحدہ ہوسٹل، ہر شعبہ کی الگ عمارت۔ لائبریری، آڈیٹوریم، جمنازیم وغیرہ عمارتیں یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان سب کو جوڑتی پکی سڑکیں۔ سڑکوں کی دونوں جانب سایہ دار درخت۔ ہر چورستے پر ایک حوض۔ حوض میں کھلے لال سفید کمودنی کے پھول۔ جہاں حوض نہیں تھا وہاں دُور دُور تک پھولوں کے تختے بچھے ہوئے تھے۔ گاندھین تھاٹ شعبے کی بلڈنگ تو تین اطراف میں پانی سے گھری ہوئی تھی۔

یامنی ان نظاروں کے درمیان سحر زدہ سی آگے بڑھتی رہی۔ اس یونیورسٹی میں ریفریشر کورس کے لیے منتخب ہونا وہ اپنی خوش قسمتی مانتی ہے... پورے تیس روز رہنا ہے یہاں۔ اس دوران وہ اس دلکش ماحول کے ذرّے ذرّے سے امرت کھینچ کر اپنے دل و دماغ کو سر سبز کرلے گی۔ اُس کے اپنے صنعتی شہر کے آلودہ ماحول نے جو تاوان آج تک اُس کے جسم اور دماغ سے وصول کیا ہے، اسے سود سمیت وصول کر کے اس ریفریشر کورس کو با مقصد بنائے گی۔

اوّل روز، تعارفی پروگرام میں وہ سب کی محترم، سب کی اپنی بن گئی تھی۔ ہما چل پردیش، اڑیسہ، گجرات، تامل ناڈو، مہاراشٹر سے آئے لکچررس نے اس کورس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اپنی تعلیمی قابلیت، ریسرچ کے تجربے، دُنیائے ادب کی کامیابی اور پھر ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ جو بے اختیار یامنی کو سب کے قریب لے گئی تھی، اُسے سب سے ممتاز بنا گئی تھی۔

منموہن سنگھ نے تو دوسرے ہی روز کہہ دیا تھا: ''غیر شادی شدہ معمر عورتوں جیسی کوئی بات نہیں ہے دیدی آپ میں۔''

''غیر شادی شدہ عورتیں کیا دوسری دُنیا کی مخلوق ہوتی ہیں؟'' یامنی نے ہنس کر پوچھا تھا۔

''نہیں... مگر ایسی عورتیں ذہنی پیچیدگی اور اُلجھاؤ کا شکار ہوتی ہیں۔ چاہے اُن کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہو، چاہے انھوں نے کسی کے لیے قربانی دی ہو وہ نارمل زندگی نہیں گزار پاتیں۔ اُن کی اُلجھنیں دوسروں کو بھی کوفت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔''

یامنی نے سر ہلا کر کہا تھا: ''جو قربانی یاس اور نا اُمیدی کو جنم دے، میں اُسے قربانی نہیں مانتی۔ قربانی دے کر اُس کے پھل کی اُمید کرنا تیاگ کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ ہندستانی فلمیں نہیں دیکھتے تم؟ ہیرو تیاگ کرتا ہے اور پھر خود کو شراب میں غرق کر دیتا ہے۔ ہیروئن تیاگ کرتی ہے اور خودکشی کرنے نکل پڑتی ہے یا گیت گا کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے... تیاگ کیا تھا بھیشم نے... تیاگ کیا تھا کرن نے... ویسا تیاگ کرے کوئی تو مانوں۔''

اشوک موہنتی جو اُن کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا جذباتی ہو کر بول اُٹھا تھا: ''میں تمھیں نمسکار کرتا ہوں دیدی! جب تم بولتی ہو تو لگتا ہے کہ بس بولتی رہو اور ہم سنتے رہیں۔ تم میری ماں ہو۔ میری بہن ہو، تم دیوی ہو دیدی۔''

''مجھے دیوی نہ بناؤ، دیدی ہی رہنے دو۔ دیوی کے منصب میں وہ شان نہیں ہے جو عورت ہونے میں ہے... میں نے تمام زندگی جدوجہد کی ہے... حالات سے جنگ کی ہے۔ ماتا پتا کی خدمت کی ہے، ان کے انتقال کے بعد چھوٹے بھائی بہنوں کو سیٹل کیا ہے۔ میں دیوی ہوتی تو یہ سب نہیں کر سکتی تھی۔ دیوی صرف ہاتھ اُٹھا کر آشیرواد دیتی ہے، ہاتھ تھام کر منزل تک نہیں پہنچاتی... یہ تو صرف عورت کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔''

''وہی تو... وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ لاتعداد فرائض کے بوجھ سے دبی دیدی، کیونکر اتنی مطمئن اور ہنس مکھ رہ سکتی ہے؟ گھر میں مصروفیت، باہر کے کام، اندرونی کشمکش، گزرے کل کا حساب کتاب، آنے والے کل کی فکر... کیسے ان سب میں تال میل بٹھا لیتی ہیں آپ؟'' منموہن نے انتہائی عقیدت سے دریافت کیا تھا۔

منموہن، اشوک موہنتی کا ہم عمر تھا مگر ایک پختگی تھی اس میں... مزاج میں، اظہارِ خیال دونوں میں۔ اپنے عہدہ کا ہمیشہ خیال رکھتا۔ کوئی بات زبان سے ایسی نہ نکالتا جو ایک لکچرر کی شان کے خلاف ہوتی۔ دو بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کرنے کے باوجود زمین پر چلتا

تھا۔ غیر ممالک کی چکا چوندھ سے متاثر نہیں ہوا تھا... ایک دیوانند لانڈے تھا... ہمیشہ خالی برتن کی طرح بجتا رہتا۔ اُسے اپنے ساتھیوں کا یامنی سے بے تحاشہ متاثر ہونا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔ خود اُسے دو باتیں نہایت عزیز تھیں۔ ایک، اپنی پستہ قد، خبطی، بانجھ بیوی کی بُرائی کرنا، دوسرے اپنی ساتھی لیکچرر نشی کا اُس سے مقابلہ کرنا۔ غیر ممالک کی کانفرنسوں کے، جہاں اُس کے ساتھ اس کی بیوی نہیں، نشی گئی تھی... حالات سنانا بھی اُسے بے حد مرغوب تھا۔ نشی نے یہاں اس کورس میں بھی اُس کے ساتھ آنے کی جی توڑ کوششیں کی تھیں مگر خبطی بیوی نے پرنسپل سے مل کر ایسا چکّر چلایا کہ دِلوں کے ٹکڑے ہو گئے۔ ایک گراچنڈی گڑھ میں، دوسرا کوروکشیتر میں۔

منموہن کا سوال یامنی سے تھا مگر لانڈے نے بیچ میں منہ ماردیا: ''اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ یامنی دیوی اچھی اداکارہ ہیں۔ مختلف رول بخوبی نبھالیتی ہیں۔''

یامنی نے اُس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے منموہن سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں گھر سے نکلتی ہوں تو اپنی تمام فکریں اور گھر کے دُکھ گھر ہی میں چھوڑ دیتی ہوں۔ گدلے پانی میں پھٹکری گھمانے پر میل کٹ کر تہہ میں چلا جاتا ہے... اُوپر رہ جاتا ہے صاف شفاف پانی۔ میں بھی دل کی گہرائیوں میں اپنی فکریں اور مسائل ڈال کر ہنستا چہرہ لیے باہر نکلنا پسند کرتی ہوں۔''

ہوسٹل میں رات کے کھانے کے بعد وہ سب کسی ایک کے کمرے میں جمع ہو جاتے... گانا بجانا ہوتا، لطیفے سنائے جاتے پھر نہ جانے کب ایسا ہوتا کہ یامنی بولنے لگتی اور باقی سب سامع بن جاتے۔ ویسے تو سب یامنی کو اپنے لگتے تھے مگر ہرشا، روما، اشوک اور منموہن میں اُسے اپنی بہنوں اور بھائی کی جھلک ملتی۔

ہرشا اُسے بے حد پسند تھی۔ اپنی چھوٹی بہن کنیکا کی طرح وہ اسے چاہتی۔ ایک وہی تو تھی جو یامنی کے درد کو سمجھتی تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد دیدی کی ذمّہ داریوں کو کم کرنے کے لیے ملازمت کرنا چاہتی تھی مگر شوہر اور ساس نے کچھ کرنے نہیں دیا۔ یامنی سے وہ ہمیشہ شکایت کرتی کہ کیوں اُس کی شادی اتنی جلد کر دی کہ وہ بس گھر گرہستی کی ہو کر رہ گئی۔

مونیکا اُس سے چھوٹی تھی، روما جیسی شوخ، کھلنڈری۔ شوخی کے ساتھ ضد اور نافرمانی اُس کی گھٹّی میں پڑی تھی۔ اپنے اس مزاج کی بدولت بہت دُکھ اُٹھائے مونیکا نے۔ دِنیش سے محبت کی شادی اُس نہ ختم ہونے والے سلسلے کی پہلی کڑی تھی جس میں اُس نے یامنی کو پھنسا کر رکھ دیا تھا۔

دِنیش اور مونیکا شادی کے لیے ایک ماہ رُکنے کو تیار نہیں تھے جبکہ یامنی چاہتی تھی کہ مونیکا دِنیش کو اچھی طرح سمجھ لے...مگر دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کے پانچ ماہ بعد ہی مونیکا کے سر سے پیار کا بخار اُتر گیا۔ دِنیش بے حد تکلیف دہ ہو گیا تھا اُس کے لیے۔ مونیکا اب اسی دیدی کی گود میں سر رکھ کر روتی تھی جس پر کبھی اُس نے خود کے غیر شادی شدہ رہ جانے سے بہن کو ازدواجی زندگی میں داخل ہونے سے روکنے کا الزام لگایا تھا۔ یامنی نے کبھی ذکر نہ نکالا اور سمجھا بجھا کر اُسے شوہر کے پاس بھیجتی رہی۔ ماتا پتا کے نہ رہنے سے اب وہی اُن کی ماں تھی، وہی ان کا باپ تھی۔ پریش دامن چھڑا کر غیر ملک چلا گیا تھا اس لیے بڑے بھائی کی ذمہ داری بھی اس کے کندھوں پر آ پڑی تھی... یامنی دونوں میں صلح صفائی کی اپنی کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد ہمت ہار چلی تھی کہ وہ حادثہ ہو گیا۔ دِنیش شراب پی کر گھر آیا تھا۔ مونیکا نے اعتراض کیا تو آپے سے باہر ہو کر اُسے مارا پیٹا اور اسکوٹر اُٹھا کر نکل گیا۔ شراب نے پہلے ہی عقل پر تالے لگا دیے تھے غصہ نے غضب کر دیا۔ پھر وہ تو گھر نہ آیا، اُس کی موت کی خبر ہی آئی۔

دِنیش مثالی اور محبت کرنے والا شوہر نہیں ثابت ہوا تھا مگر مونیکا سال بھر میں اُسے بھلا دے گی اس کی توقع یامنی کو نہ تھی۔ وہ خود اپنی لاڈلی بہن کو زندگی بھر بیوگی کا بوجھ نہ اُٹھانے دیتی مگر گیارہ مہینے بعد ہی وہ سدھیر کو اس سے ملانے لے آئی تو حیرت زدہ رہ گئی یامنی۔

سدھیر ایک دولت مند خاندان کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ یامنی نے اُسے اپنے والدین کے ساتھ آکر رِشتہ مانگنے کے لیے کہا تو سر جھٹک کر بولا تھا: ''ہو کیئر فار دیم! اِز اِٹ ناٹ اِنف کہ میں مونیکا کو لائک کرتا ہوں۔''

یامنی دودھ کی جلی تھی۔ والدین کو ساتھ لانے کی ضد پر اڑی رہی۔ سدھیر گیا تو پلٹ کر نہیں آیا۔ پھر کہیں اور شادی کر لینے کی خبر بھی اُسے مونیکا ہی نے دی اور اس کی گود میں سر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اُسے رونے کے لیے ایک ہی کندھا تھا۔ منہ چھپانے کے لیے ایک ہی گود تھی۔ یامنی نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا تھا: ''مونی، جب تم اور سدھیر چھپ چھپ کر ملاقاتیں کر رہے تھے تب ایک روز اس کے پاپا آکر مجھے دھمکا گئے تھے۔''

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' مونیکا نے تڑپ کر کہا تھا۔

''کیسے بتاتی؟ تم مجھ پر اپنے لَو افیئر میں کانٹا بننے، مجھ پر ویمپ ہونے کا الزام نہ

لگا دیتیں۔'' یامنی نے شفقت آمیز ہنسی سے اُسے پرانی بات یاد دلائی تھی۔

مونیکا کچھ اور سمٹ گئی تھی اُس کی بانہوں میں۔ یامنی کو بہت اچھا لگا تھا۔ چند روز بعد یامنی نے اپنے آفس کے سپروائزر سے مونیکا کا بیاہ کرا دیا تھا۔ اب وہ بھی کنیکا کی طرح پرمسرّت ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔

ہر عورت کی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی کے چیتھڑے چیتھڑے واقعات اور بکھرے رنگ جمع کر کے ایک مکمل تصویر بنانے اور اس میں اپنی پسند کے رنگ بھرنے کی کوشش کرتی ہے...وہ رنگ نہیں جو دھوپ، گرمی، بارش سے اِدھر اُدھر سے ہلکے پڑ جاتے ہیں، اُڑ جاتے ہیں بلکہ پکّے رنگ... ہمیشہ قائم رہنے والے رنگ۔ کسی کی زندگی میں یہ وقت تب آتا ہے جب وہ نواسوں، پوتیوں میں گھری جی رہی ہوتی ہے، کسی کی زندگی میں اُٹھتے بیٹھے، سوتے جاگتے تنہائیوں میں یہ وقت آتا ہے اور رنگوں کو بکھیر دینے کے بعد ایک ٹیس چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

یامنی نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی...ایک ایسا درخت بن گئی تھی جو سایہ دینے میں اپنے پرائے کا بھید نہیں کرتا۔

ایک رات روما اپنا کمبل لے کر اُس کے کمرے میں آ گئی تھی: ''دیدی! میں آج آپ کے کمرے میں سو جاؤں۔''

''کیوں نہیں؟ ضرور آؤ۔'' یامنی تکیے سے ٹیک لگائے بستر پر دراز کتاب پڑھ رہی تھی۔ روما برابر والے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ تھرماس میں چائے لے کر آئی تھی۔ چائے پی چکیں دونوں تو روما بولی: ''دیدی! میں آج آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتی ہوں۔''

''سناؤ۔'' یامنی کتاب ایک طرف رکھ کر ہمہ تن گوش ہو گئی۔

روما نے بی.اے کیا، اُس کی شادی ہو گئی۔ دو برس تک ٹھیک ٹھاک چلا سب، پھر جو اختلاف شروع ہوئے تو طلاق پر ختم ہوئے۔ کہانی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایک عام گھسی پٹی کہانی تھی۔

''دیدی، میرے ماتا پتا میری دوسری شادی کر دینا چاہتے تھے، میں نے انکار کر دیا۔ میں زندگی کو نیا موڑ دینا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا، گھر گرہستی میں لگ جاؤں گی تو اپنی منزل تک کیسے پہنچوں گی؟ میں نے شارٹ کٹ اختیار کیا۔ بی.ایڈ میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ساتھ ایم.اے کی

بھی تیاری شروع کر دی۔ ایم.اے، ایم.ایڈ ہونے کے بعد پی.ایچ.ڈی بھی کر لی۔ لکچرر بن گئی۔ اب میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ سے مشورہ چاہتی ہوں۔ کہیے تو؟ کیا میرا فیصلہ صحیح ہے؟... لیکن...'' وہ قدرے رُک کر حیرت سے بولی: ''دیدی! میری کہانی سن کر آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟ یہاں تو سب یہی جانتے ہیں کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔''

''ہرشا کے سوا!'' یامنی انگلی اُٹھا کر دھیمے سے ہنسی۔

روما حیرت سے بولی: ''اُس نے آپ کو بتایا؟ کب بتایا؟''

''اُس روز، جب تمھاری اس سے پہلی جھڑپ ہوئی تھی... اور... اور میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ ابھی بھی تم اس سے جھگڑا کر کے آئی ہو، کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''نہیں۔'' روما نے نفی میں سر ہلایا۔ یامنی نے کہا: ''چھوڑو اس بات کو۔ ماتا پتا کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے مشورہ کیوں کر رہی ہو؟''

''وہ سیدھے سادے غیر تعلیم یافتہ دیہاتی لوگ ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اب میرے اسٹیٹس میں کتنا فرق آ گیا ہے۔ دس برس پہلے جس طرح ایک نااہل کو مجھے سونپ دیا تھا ویسے ہی آج کسی کے بھی پلّے باندھ دینا چاہتے ہیں۔'' روما تیز ہو کر بولی تھی۔

''میرا خیال ہے...'' یامنی نے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا ''روما، اب تمھارے لیے کسی سے بھی ایڈجسٹ کرنا مشکل ہوگا۔ طلاق کے فوراً بعد تم نے شادی کر لی ہوتی تو بہتر ہوتا۔ ٹھوکر کھائی ہوئی تھیں، ہر قدم سنبھل کر رکھتیں مگر تم نے راستہ ہی بدل دیا۔ ایک مرد سے شکست کھانے کے بعد تمھیں مردوں کے برابر بننے اُن سے مقابلہ کرنے کا خیال آیا۔ تم اس پر عمل پیرا ہوئیں۔ یہ شارٹ کٹ کی خصلت انسان کو جدّوجہد کرنے سے روکتی ہے۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ شادی کے بعد بھی تعلیمی قابلیت بڑھائی جا سکتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی لیکن شادی کی ایک عمر ضرور ہوتی ہے۔ پختہ عمر میں شادی کی کامیابی کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی... میں بہت کڑوا تو نہیں بول رہی ہوں؟''

''کڑوا تو ہے مگر شاید سچ بھی ہے۔'' روما کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ یامنی نے سوچا اس گہرائی کا پوری طرح روما کو اندازہ کرانا ہوگا پھر وہ خود ہی اس بھنور سے باہر آ سکے گی۔ بولی: ''اِتنے دِنوں سے تمھیں دیکھ رہی ہوں۔ کم عمر کی کامیابیوں نے تمھیں

مغرور بنا دیا ہے۔ تمھاری اَنا کو بڑھا دیا ہے۔ اب تم سے کم تعلیم یافتہ مرد تمھاری اَنا کو مطمئن نہیں کر سکتا اور تمھارے ہی معیار کا کوئی مِل گیا تو ٹکراؤ یقینی ہے۔ شادی اگر تم مطلقہ ہونے کا داغ مٹانے یا شادی شدہ کہلانے کے شوق میں کرنا چاہتی ہو تو اور بات ہے۔ سچّے معنی میں شریکِ حیات اور ماں بننا چاہتی ہو تو تمھیں خود کو بدلنا ہوگا...''

''دیدی!'' روما نے شکایت بھرے لہجے میں کہا تھا: ''کیا آپ بھی عورت کو مرد سے کمتر سمجھتی ہیں۔ علیحدگی کی ذمّہ دار عورت کو سمجھتی ہیں۔ میرے ماتا پتا جی بھی ہمیشہ مجھے ہی الزام دیتے ہیں۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔'' یامنی نے روما کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: ''میں زن و شوہر میں علیحدگی کی ذمّہ دار تنہا بیوی کو ہرگز نہیں ٹھہراتی لیکن کامیاب ازدواجی زندگی اور جنّت جیسی زندگی کا کریڈٹ صرف اور صرف عورت کو دیتی ہوں۔ گھر کو دوزخ بنانے کے الزام کی جگہ گھر کو جنّت بنانے کے اعزاز سے عورت کو سرفراز ہونا چاہیے۔''

روما خاموشی سے سنتی رہی تھی۔ کسی طرح کی بحث نہیں کی تھی ورنہ وہ بہت کم کسی کی بات سنتی، مانتی تھی۔

ریفریشر کورس کے آغاز کے دِنوں میں یامنی کے سوا سب کے سب کلاس میں دیر سے پہنچتے تھے۔ سجان سنگھ، ریٹا اور سُشما دوسرے شہر سے آتے تھے۔ ان کے پاس بس لیٹ ہو جانے کا بہانہ تیّار رہتا۔ ہوسٹل والے بھیانک ٹھنڈ کے سبب سویرے اُٹھ ہی نہ سکتے۔ تیسرے دن سے کوآرڈی نیٹر پروفیسر نے دیر سے آنے والوں کو حاضری دینے سے انکار کر دیا تو سب راستے پر آ گئے۔ چوتھے روز روما، ہرشا، اشوک، لانڈے، منموہن سب کلاس لگنے سے دس منٹ پہلے حاضر ہو گئے۔ یامنی نے حیرت آمیز خوشی ظاہر کی تو روما چہک کر بولی تھی: ''دیدی! ہم نے شارٹ کٹ ڈھونڈ لیا ہے اسی لیے وقت پر پہنچ گئے۔''

اب یہ شارٹ کٹ کا کمال تھا یا غیر حاضری کا خوف، جو بھی ہو۔ یامنی مسکرا کر رہ گئی۔ ''دیدی آپ بھی ہمارے ساتھ آیا کرنا۔'' روما نے پیشکش کی۔

''نا بابا نا!'' میں شام سویرے کی سیر کا لطف نہیں گنوانا چاہتی۔ میں تو سویرے جلدی اُٹھ کر سیر کرتی ہوئی یہاں پہنچوں گی۔''

یامنی کے نہ کہنے پر بھی شام کو ان لوگوں نے اُسے اپنے ساتھ لے لیا۔ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی عمارت کو پار کر کے وہ پیچھے کے پھاٹک سے نکلے۔ ساؤتھ انڈین ریسٹورنٹ کے بغل سے نکل رہے تھے کہ یامنی ٹھٹک کر رہ گئی۔ اِدھر اُدھر نوجوان لڑکے لڑکیاں بیٹھے لیٹے ایک دوسرے سے محبت کی باتوں میں مصروف تھے۔

آج کی نوجوان نسل عریانی اور فحاشی کو جدیدیت ماننے لگی ہے۔ والدین کا نوجوانوں پر نہ بس ہے نہ اختیار! عریاں بانہوں اور کھلی رانوں والی اسکرٹ پہنے بیٹی بہن کو دیکھ جو باپ بھائی آنکھیں نیچی نہیں کرتے، وہ دوسروں کی بہن بیٹیوں پر بُری نظر ڈالنے سے کب پیچھے رہنے والے۔ سونے پہ سہاگہ آج کی فلمیں، آج کا ٹیلی ویژن... فحش مناظر، غیر اخلاقی حرکات، قابلِ مذمت ڈائیلاگ دھڑلے سے پیش کیے جارہے ہیں اور باپ بیٹی، بھائی بہن، سسر بہو ساتھ بیٹھ کر دیکھ رہے ہیں۔ رقص کے دوران فحش حرکات، چومنا لپٹنا سب خرافات ہی خرافات... یامنی کا منہ کڑواہٹ سے بھر گیا۔

''دیدی! یہ کرشن نگری ہے۔ ہر گوپی کے ساتھ ایک کرشن ہے۔ چلو بھی آگے۔ جلدی ہوٹل پہنچنا ہے یا نہیں۔'' روما ہنستی ہوئی بولی تھی۔

ہرشا بولی تھی: ''دیدی! اِدھر اُدھر نہ دیکھ کرناک کی سیدھ میں چلو۔ ہر شاخ پر اُلّو کا جوڑا ہے... مطلب یہ کہ ہر جھاڑی میں ایک جوڑا ہے... اشوک وغیرہ اسی لیے آگے نکل گئے۔''

یامنی کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ نظریں جھکائے ہرشا، روما، رینا کے پیچھے چلی جارہی تھی... تو یہ ہے وہ کرشن نگری جس کا ذکر پچھلے دِنوں سنا تھا، شام ہوتے ہی جوانی کے نشے سے سرشار طلبا ان جھاڑیوں کی پناہ لے لیتے اور دوستی کا پاک رشتہ غیر اخلاقی حرکات کے اندھیروں میں گم ہو جاتا۔

''ہے بھگوان! مجھے معاف کرو، میں اب کبھی اِدھر نہیں آؤں گی۔'' یامنی نے آنکھیں بند کیں اور عین اُسی وقت جھرمٹ سے اُونچی ایڑی کے سینڈل والا ایک پاؤں باہر آیا۔ یامنی دھڑام سے نیچے جا گری۔ پُرسکون ماحول میں اس کی چیخ گونج اُٹھی۔

''دیدی! کیا ہوا؟'' روما، ہرشا، رینا پلٹ کر دوڑی دوڑی آئیں۔ روما اور رینا نے جھرمٹ میں جھانکا اور منہ چھپا کر پیچھے ہٹ آئیں۔ ہرشا یامنی کو اُٹھنے میں مدد دے رہی تھی۔ یامنی اوندھے منہ گری تھی۔ پیشانی پر چوٹ آئی تھی۔ وہ دونوں بھی گھبرا کر جھرمٹ سے نکل آئے تھے۔

لڑکی کے اسکرٹ کی چین ٹھیک سے نہیں لگی تھی۔ بلاؤز بھی مسکا ہوا تھا۔ یامنی نے اُسے دیکھتے ہی چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔

یامنی پھر کبھی اُس راستے نہیں گئی۔ روما، ہرشا، رینا اکثر اُسے اچھے موڈ میں دیکھ کرشن نگری کے قصے سنانا چاہتیں۔ یامنی کا دِل دھڑکنے لگتا مگر خاموش رہ جاتی۔ ایک روز ہرشا نے بڑے فخر سے اعلان کیا: ''آج میں نے تین گوپیوں کا انٹرویو لیا۔ اُس میں وہ بھی شامل تھی جس نے دیدی کو ٹانگ مار کر گرایا تھا۔''

''ٹانگ مار کر گرایا نہیں تھا، مدہوشی میں ٹانگ باہر آ گئی تھی۔'' روما نے تصحیح کی۔

''پلیز! اُس واقعے کا ذکر نہ کرو۔'' یامنی نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روکا تھا تو ہرشا نے بات بدل کر کہا: ''میں نے ان سے پوچھا کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں کیا وہ ٹھیک ہے؟ اور یہ کہ اُن کے والدین پر اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ ہنس کر بولیں ''والدین کو کیا پتہ کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ اور... اور کیا کرتے ہیں ہم؟ لائف اِنجوائے کرتے ہیں! ماڈرن لیلیٰ مجنوں ہیں ہم، جو زمانے سے اپنے حصّے کی خوشیاں وصول کرتے ہیں۔ پڑھائی ختم کرنے کے بعد سب اپنے اپنے راستے چل دیں گے۔ کوئی زندگی بھر کا روگ پالنے بیٹھے ہیں ہم؟؟ وی آر جسٹ اِنجوائنگ لائف۔''

''ہرشا، بس بھی کرو۔'' یامنی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ واقعہ یاد کر کے اُس کا جی اُلٹنے لگتا تھا۔

کورس ختم ہوا۔ ڈھیروں کھٹّی میٹھی یادیں لیے یامنی اپنے شہر لوٹ آئی۔ زندگی پھر اُسی ڈھرّے پر چلنے لگی۔ تین برس گزر گئے۔ مونیکا، کنیکا دو دو بچّوں کی مائیں بن گئیں۔ یامنی کو بس اب پریش کی فکر تھی۔ ایک روز اس کا بھی خط آ گیا۔ اُس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اب اُسے بہنوں سے ملانے لے کر آ رہا تھا۔

پریش نے نہ بڑے بھائی کی ذمہ داری نبھائی نہ کبھی بہنوں کا خیال کیا مگر ایک کے غیر ذمہ دار ہو جانے سے سب تو پتھّر دل نہیں ہو جاتے۔ یامنی نے بھابی کے استقبال کی زوردار تیاریاں کیں۔ کنیکا اور مونیکا بھی اپنے اپنے شوہر اور بچّوں کے ساتھ آ گئیں۔ مقرّرہ دن وہ سب پریش کو لینے ہوائی اڈّے پہنچے۔

پریش بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ مغربی لباس میں خوبصورت سی دُلہن اُس کے پیچھے تھی۔

یامنی کی نظر پریش پر تھی۔ اس کے دل میں ممتا کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ پریش اُس سے ایک سال بڑا تھا مگر والدین کی وفات کے بعد اُسی نے پریش کو سنبھالا تھا ماں بن کر، باپ بن کر۔ پریش یامنی کے گلے لگ گیا اور اُس وقت پہلی مرتبہ اس کی نظر لولیتا پر پڑی۔ اُس کے دماغ میں جیسے بم پھٹا۔ اُونچی ایڑی کے سینڈل والا ایک پاؤں اُس کی نظروں میں گھوم گیا اور اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

سب یہی سمجھے کہ جذباتیت میں یامنی کا یہ حال ہوا ہے مگر اس کے دل کا حال وہی جانتی تھی۔ لولیتا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ لولیتا کافی خوش مزاج تھی۔ کنیکا مونیکا سے جلد گھل مل گئی۔ یامنی نے دل پر پتھر رکھ کر بحیثیت بھابی اُسے قبول کر لیا۔

دوسرے روز لولیتا کو اُبکائیاں لیتے دیکھ یامنی جھپٹ کر پریش کے پاس پہنچی... ''پریش! تمھاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟''

''آج بائیس دن ہو گئے۔'' پریش نے کہا۔

''وہ لولیتا... وہ لولیتا...'' الفاظ یامنی کے گلے میں گھٹ کر رہ گئے۔

پریش نے نظریں جھکا لیں۔ ''مجھے پتہ ہے دیدی! بات یہ ہے کہ ہم دونوں کو ساتھ رہتے ایک برس سے زیادہ ہو گیا ہے۔ لولیتا جس کمپنی میں کام کرتی ہے اس کی شرطوں کے مطابق وہ شادی نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں تو یہ سب چلتا ہے۔ شادی کے سیدھے راستے میں مشکلیں تھیں اس لیے ہم نے شارٹ کٹ اپنایا...''

''بس کرو۔'' یامنی نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے پھر آواز دھیمی کر کے ایک ایک لفظ چباتی ہوئی بولی: ''بھیا پریش، میں محلّے پڑوس میں سب کو بتا چکی ہوں کہ تمھاری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تمھارا یہ شارٹ کٹ مجھے رُسوا کر دے گا۔ وہ کم سے کم تین ماہ کی حاملہ ہے۔''

''میں سمجھا نہیں... امریکہ میں یہ کوئی برائی نہیں۔''

''وہاں کی بات مت کرو۔ یہ ہندوستان ہے۔ ہماری تہذیب کے کچھ معیار ہیں، کچھ آدرش ہیں...'' قدرے رُک کر اُس نے سختی سے کہا: ''بہتر ہوگا اگر تم لوگ کل سویرے ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ اسے چاہو میری درخواست سمجھو یا میرا حکم۔ جانا تو تمھیں ہوگا ہی۔''

OO

بستی بستی کا جال

شہر کے آخری سرے پر بنے مکان میں جب وہ شفٹ ہوئی تھی تو دُور دُور تک آبادی کے آثار نہ ہونے سے اُسے کوئی فرق نہیں پڑا کہ وہ بھیڑ میں شامل رہ کر بھی تنہا چلنے کی عادی ہو چکی ہے۔ لیکن بیگانی شادی میں دیوانے عبداللہ لوگوں کو چین کہاں؟ پوچھتے ''آپ کو ڈر نہیں لگتا؟ کتنا اندھیرا ہے یہاں؟''

وہ دِل میں کہتی: ''اپنے اندر پھیلے ہوئے اندھیروں سے جو مانوس ہیں، باہر کا اندھیرا اُن کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ڈر اندر ہوتا ہے۔ دل میں، خیالوں میں، آنکھوں میں، پورے جسم میں۔ باہر تو فقط عکس ہوتا ہے...'' بظاہر جواب دیتی... ''مجبوری ہے۔ اپنا مکان آخر اپنا مکان ہوتا ہے۔ دیکھنا، سال دو سال میں یہاں کیسے بستی بستی ہے۔''

اماں بھی بولیں: ''کہاں ویرانے میں جا بسے ہو تم لوگ!''

نئے مکان میں پہلا کام جو اُس نے ہاتھ میں لیا وہ اپنے کتب خانے کو سنوارنے کا تھا۔ دوسرا سامان کھولا تک نہیں۔ کھانے کا ڈبہ دونوں وقت اماں بھیج دیتیں۔

چوکیدار کی آٹھ سالہ بیٹی تجسّس سے اُس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دِن دیکھا، دو دن دیکھا... کتابوں کے بکسے کھل رہے ہیں اور کوئی سامان نہیں... بے تاب ہو کر پوچھ بیٹھی: ''تمھارے گھر میں برتن نہیں ہیں؟''

اُس نے ہنس کر کہا: ''نہیں ہیں۔ میں کتابیں ہی کھاتی ہوں۔''

دماغ کی غذا، کتابیں ہی ہوتی ہیں۔ رُوح کی بھوک مطالعہ ہی سے تسکین پاتی ہے۔ اُسے کھانے کو نہ ملے، کتابیں مل جائیں بس... وہ اُس کی ہمدم، ہمراز ہیں۔ صحیح معنوں میں حیات کی

شریک۔زندگی کی ساتھی۔

ایک رات موسلا دھار بارش ہوئی۔سویرے اُٹھ کر دیکھا۔گیٹ کے سامنے تالاب بن گیا تھا۔بچپن یاد آ گیا۔ناؤ بنا کر پانی میں چھوڑنے کی خواہش ہوئی۔

تنہا ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے۔چھوٹی بڑی سب خواہشیں پوری کرلو۔کوئی دیکھنے والا نہیں،کوئی ٹوکنے والا نہیں...نہ مضحکہ اُڑانے والا کوئی۔

وہ کاغذ موڑ موڑ کر کھولتی رہی۔کاغذ نے ناؤ کی شکل اختیار نہیں کی۔اُف خدا! وہ ناؤ بنانا بھول گئی تھی۔بہت دِنوں سے بنائی نہیں تھی نا!! ایسی غفلت اُس سے کیوں کر ہوئی؟ اپنی محرومی اپنے درد کو وہ اسی لیے جب تب تازہ کرتی رہتی ہے کہ کہیں محرومی کا احساس فنا نہ ہو جائے۔درد مٹ کر لا دوا نہ بن جائے۔تنہائی اُس سے چھن گئی تو اُس کا وجود بھی تو نہیں رہے گا۔

وہ کوشش کرتی رہی...کرتی رہی۔آخر کاغذ نے ناؤ کی شکل اختیار کرلی۔اُتھلے پانی میں پاؤں جماتی وہ گہرے پانی کی طرف چلی۔دیکھتے دیکھتے ایک لمبا سانپ سامنے سے گزر گیا۔ناؤ پانی میں تیرا کر اُس نے چوکیدار کو آواز دی۔سانپ کے بارے میں بتایا۔وہ بولا: ''موسم کی پہلی برسات ہے۔بِلوں میں پانی بھر گیا ہے۔اب دیکھنا بائی،سانپ بچھّو کیسے اُبلتے ہیں۔''

شام کو چوکیدار نے دیکھا،وہ سینڈلیں ہاتھ میں لیے،ساڑی اُونچی کیے،چھَپ چھَپ کرتی ہوئی تالاب کے اُس پار جا رہی ہے۔اُس سے رہا نہ گیا۔تعریفی انداز میں بولا: ''آپ بڑی دلیر ہیں۔سویرے ہی تو اتنا بڑا سانپ دیکھا تھا۔''

وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گئی۔ہنہ! سانپ سے کیا ڈرنا؟ چوکیدار کیا جانے کہ سانپوں سے اُس کا کتنا قریبی رشتہ ہے۔کوئی چیز حرکت کرے،اندیشہ ہوتا،سانپ ہے۔بیٹھے بٹھائے چلتے چلاتے محسوس ہوتا سرر...ررّ سے سانپ نکل گیا۔کوئی رات ایسی نہیں جاتی جب خواب میں دو چار سانپ نظر نہ آتے ہوں۔وہ نفسیات کی طالبہ رہ چکی ہے۔اُس نے بارہا اُن وجوہات کو ڈھونڈنے کی سعی کی ہے جو اس خوف کی جڑ میں ہیں۔اپنی محرومی،تنہائی اور درد کے پس منظر میں اس کامپلیکس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔نتائج واضح اور مثبت ہونے پر بھی اُن کی نفی کرنے میں اُسے خوشی ہوتی ہے۔وہ تصور کرتی ہے...گویا وہ ناگ لوک سے جلاوطن کی گئی کنّیا ہے۔اسی لیے اس دُنیا کے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی ہے۔اپنے آس پاس عالمِ خواب

میں، عالمِ بیداری میں سانپوں کی موجودگی محسوس کرتی ہے۔ شعوری، غیر شعوری طور پر اپنے کو ان میں سے ایک سمجھتی ہے۔

''چوکیدار! مجھے ناگ ناگن کا جوڑا دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اس ویرانے میں تمھیں دیکھنے کا اتفاق ہو تو مجھے بھی ضرور دِکھانا'' وہ چوکیدار سے کہتی ہے۔

''ناگ اپنا جوڑا دھامَن کے ساتھ بناتا ہے ناگن کے ساتھ نہیں'' چوکیدار نے کہا:

''آپ پڑھے لکھے لوگ مانتے نہیں۔ میں آپ کو دِکھاؤں گا تب تو یقین کریں گی۔''

اُس نے چوکیدار کی بات کی تردید نہیں کی۔ وہ خیالوں میں کھو چکی تھی۔

وہ جو اپنے کو ناگ کنّیا سمجھتی ہے تو غلط کیا ہے؟ اس کا ناگ کسی دھامن کے ساتھ مگن رہتا ہے اور وہ بے اعتنائی کے جزیرے میں تنہائی کا عذاب جھیلتی رہتی ہے۔

پڑوس میں تعمیر کے آثار نظر آئے تو اُسے اچھا نہیں لگا۔ تھوڑا اطمینان بھی ہوا۔ اچھا اس لیے نہیں لگا کہ تنہائی میں خلل پڑ رہا تھا۔ لوگ سناٹے سے گھبراتے ہیں اُسے خاموشی عزیز ہے۔ کیونکہ خاموشی ہی میں وہ اپنے اندر کی آواز سن سکتی ہے... اطمینان یوں ہوا کہ بھلائی چاہنے والوں سے کہہ سکے گی... ''دیکھیے بستی بس رہی ہے۔''

مکان کی بنیاد رکھی جانے لگی تو جنگل میں منگل ہو گیا۔ رنگین ساڑیاں لہرانے لگیں۔ مردوں کے قہقہے گونجنے لگے، بچّوں کی کلکاریاں سنائی دینے لگیں۔ ٹرکوں، ٹریکٹروں کا شور ہونے لگا... اُس نے سوچا، میری نئی کہانی کے کردار یہی ہوں گے۔ یہ میرے آرام میں خلل انداز ہونے والے، میری تنہائی کو بھیڑ میں بدلنے والے...

اُن میں سے کوئی نہ کوئی یقیناً ہی اس سے اپنی کہانی لکھوانے میں کامیاب ہو جائے گا ورنہ آج کل ہوتا یہ ہے کہ وہ قلم ہاتھ میں لیتی ہے۔ ایک دو سطور لکھتی ہے کہ مختلف خیالات یلغار کر دیتے ہیں کہ مجھے فوقیت دو۔ مجھے کاغذ پر اُتارو ورنہ میں آؤٹ ڈیٹیڈ ہو جاؤں گی... ہو جاؤں گا، کبھی کبھی تو کوئی بے باک خیال صاف کہہ دیتا ہے... تمھاری زندگی ختم ہو جائے اس سے پہلے مجھے زندگی دے دو، اس وقت وہ واقعی سہم جاتی ہے۔ اُف! اگر ایسا ہو گیا تو؟ رُوح کو غذا فراہم کرنے والی کتابیں، رُوح کے جسدِ خاکی سے نکل جانے کے بعد کیا خالی پنجرہ کے تئیں انسانوں کی طرح اپنا فرض نبھا سکیں گی؟ مٹّی کو مٹّی میں ملا سکیں گی؟ یا بے جان کتابوں کے

درمیان وہ اُس وقت تک لاوارث پڑی رہے گی جب تک برسات کے سبب پانی بھر جانے سے ناگ بل کے باہر نہ آ جائے گا؟

خوف سے نجات پانے کے لیے وہ خود کو کرداروں کی تلاش میں گم کر دیتی ہے۔ نظر شیونتی پر رُک جاتی ہے۔ وہ اپنے شیر خوار بچّے کو لے کر کام پر آتی ہے...اُس کے کمپاؤنڈ کی دیوار اور ببول کے درخت کی شاخ کے درمیان جھولا باندھ کر بچّے کو ڈال کر کام میں لگ جاتی ہے۔ گھنٹے گھنٹے میں دودھ پلاتی ہے۔ کبھی گھنٹہ سے بھی پہلے، جب دودھ کا بوجھ گھمیلا اُٹھانے میں مانع ہو جاتا ہے تب ٹھیکیدار اُسے کاہلی، کام چوری پر محمول کر کے گالیاں دیتا ہے...'حرام خور' کے سوا مخاطب نہیں کرتا...اُس وقت شیونتی کی آنکھوں میں جو بے بسی پسری دِکھائی دیتی ہے اُس پر کہانی تو کیا مکمّل ناول لکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہانی کا تانا بانا بننے لگتی ہے...جو ماں ہے وہ لاچار ہے....جو ماں نہیں ہے وہ بھی دُکھ بھوگ رہی ہے۔

شیونتی شاید بے بس ممتا کو زبان دینے میں کامیاب ہو جاتی اگر مادھو اور اُس کی بیوی سامنے نہ آ جاتے۔ مادھو بیاہ کر کے آیا تو اس نے اُس کی بیوی کو گھریلو کام کرنے کے لیے بلایا۔

مادھو بولا: ''میری گھر والی میرے گھر کی رانی بن کے رہے گی۔ دوسروں کے گھر کی خادمہ نہیں بنے گی۔ اُجلی رنگت ہے... باہر نکلنے سے رنگ جل جائے گا۔''

غرور کب کس کو راس آیا ہے؟ ایک بیٹے کی آس میں چھ بیٹیاں پیدا کر چکنے کے بعد اُجلا رنگ خواب کی بات ہو گیا۔ صحت مند جسم ہڈّیوں کا ڈھانچہ بن گیا تو نکلی کام پر۔ اب چار اینٹیں لے کر چلتی تو ڈگمگاتی تھی...ناخواندگی، جہالت، ضعیف الاعتقادی کے ناگوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے لکھنی ہو گی کوئی جلتی ہوئی تحریر!

اُس نے قلم اُٹھایا تھا کہ نمّی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ نو دس برس کی یہ معصوم لڑکی اسکولی یونیفارم پہنے رامی، پھلوا، شکن اور بملا کے بچّوں کے ساتھ تمام دن ریت کے ڈھیر پر کھیلتی رہتی ہے۔ اُس کے پاس کپڑوں کا یہی ایک جوڑا ہے...اسکول کھلنے تک تو روزانہ پہننے سے پھٹ جائے گا۔ اُس نے فوراً ایک جوڑا خرید کر اُسے دے دیا۔ ''اسکول کا ڈریس اسکول میں پہننا۔ روزانہ پہن کر خراب نہ کرو۔''

وہ حیرت سے بولی: ''اسکول کا ڈریس!! یہ تو ایک بائی نے دیا ہے۔ میں اسکول نہیں جاتی۔''

کچھ رُک کر طفلانہ شوق سے بولی: ''مگر مجھے اسکول جانا اچھا لگتا ہے۔''

جو جس چیز کی خواہش کرے وہ اُسے مل ہی جائے یہ ضروری تو نہیں ہے؟ مگر حقوق تو سب کو اپنے اپنے ملنے ہی چاہئیں — وہ اپنے حق کو روتی بیٹھی ہے۔ نمّی کو اُس کے حقوق کا علم ہی نہیں۔ اسکول جانے کی عمر والی لڑکیوں کو اسکول نہ جانے دینا ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ یہ اُسے اسی وقت معلوم ہوگا جب وہ علم حاصل کرے گی... اُسے آواز اُٹھانا ہے نمّی کے لیے... معاملہ چھوٹی عدالت کا ہے... نپٹ جائے گا۔ اُس کا معاملہ سب سے بڑی عدالت کا ہے جہاں یکطرفہ فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاملے میں بے بس ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے رونے میں دوسروں کو فراموش کر جائے۔ اسکول جانے کی عمر میں ریت کے ڈھیر پر کھیلنے والے کل مزدوری کریں گے۔ ہوٹلوں میں برتن دھوئیں گے، کارخانوں میں موٹریں صاف کریں گے مگر اسکول نہیں جا سکیں گے۔ یہ ایک یونیورسل پرابلم ہے، عالمی مسئلہ بن گیا ہے۔ اسے وقت کی آواز میں آواز ملانا ہوگا...

وہ لکھنا چاہتی ہے مگر لکھ نہیں پاتی... لاجونتی، جس کا پتی اسے روز شراب پی کر مارتا ہے، جسم کا جوڑ جوڑ دُکھنے پر بھی اُسے مزدوری کے لیے بھیجتا ہے، اُس سے اپنی کہانی لکھنے کی درخواست کرتی ہے۔ شنکر مستری کہتا ہے، میری بہن کی زندگی برباد کر کے چھاتی پھلائے گھومنے والے ٹھیکے دار کو بے نقاب کرو۔ پنڈت رام آسرے، فسادات کا شکار اپنے خاندان والوں سے جدائی کا داغ دُنیا والوں کو دِکھانے پر زور دیتا ہے۔

وہ لکھ نہیں پاتی ہے۔ شیونتی، نمّی، مادھو، رامی، پھلوا وغیرہ سب اُس کی آنکھوں کے سامنے گڈمڈ ہونے لگتے ہیں — پڑوس میں مکان بن کر تیار ہو جاتا ہے مگر کہانی مکمل نہیں ہوتی ہے۔ نہ ہو۔ کوئی بات نہیں۔ مکان تو بنتے ہی رہیں گے... کبھی نہ کبھی تو اُسے ایسا کردار ملے گا جو اُس سے اپنی کہانی لکھوا لے گا۔

بستی تیزی سے بسنے لگی ہے... تنہائی، قصے کہانی کی چیز بن گئی ہے اسی لیے وہ اپنے اندر بہت عرصہ سے نہیں جھانک سکی۔ ایک جال وہ اپنے ہی گرد بنتی رہی تھی جس میں مکڑی کی طرح قید ہو گئی ہے۔ جیسے جیسے بستی بس رہی ہے وہ اُجڑتی جا رہی ہے۔ خود کہانی بنتی جا رہی ہے۔

○○

نیا موڑ

غضب کی گرمی پڑ رہی تھی اس دن۔ گھر لوٹ کر میں نے غسل کیا اور شب خوابی کا لباس پہن کر ڈرائنگ روم میں ٹی وی چلا کر بیٹھ گیا۔ خبریں آ رہی تھیں۔ اسی وقت وہ دروازے پر آ موجود ہوا۔

''صاحب! ڈبہ لایا ہوں۔'' میں نے اشارہ سے ڈبہ میز پر رکھ دینے کو کہا اس نے ڈبہ رکھ دیا مگر گیا نہیں۔ ''کیا ہے اب؟ خالی ڈبہ سویرے لے جانا۔ میں نے جھنجھلا کر نظر اس کی طرف اٹھائی اور پہلی دفعہ نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ ٹی وی میں نظریں گڑائے ہوئے تھا۔ آٹھ یا زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر ہوگی اس کی۔ خوب کالے گھنگھریالے بال۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن بڑے اور گندگی سے بھرے ہوئے۔ مجھے بڑی گھن آئی۔ کہا '' جا جلدی۔ ٹی وی دیکھتا کھڑا رہے گا تو تیرا مالک چلاّئے گا۔''

وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔

شادی کے گیارہ برسوں میں پہلی مرتبہ میں تنہا رہ رہا تھا۔ سونا کو میں میکے جانے دیتا تھا نہ وہ جانے کی ضد کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل تھے۔ ہماری کوئی اولاد نہیں تھی۔ کئی مرتبہ ہمارے یہاں بچّے کی آمد آمد ہوئی لیکن ہر مرتبہ بہار سے پہلے خزاں آ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب سونا نے چھ ماہ پورے کر لیے تھے۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے اور احتیاط برتنے کے لیے کہا تھا۔ میں ضد کر کے اسے میکے پہنچا آیا تھا۔

سونا مجھے وانتی بائی کے بھروسے چھوڑ گئی۔ وانتی ہمارے گھر میں نو برس سے کام کر رہی تھی۔ پورا گھر سنبھالتی تھی۔ دس بارہ روز تو آرام سے گزر گئے۔ اچانک وانتی کا بیٹا گزر گیا۔ وہ

چھوٹے بیٹے کے ساتھ شہر میں رہتی تھی۔ بڑا لڑکا بیوی بچّوں کے ساتھ گاؤں میں رہتا تھا۔ بہو اور بچّوں کو سنبھالنے کے لیے واسنتی بائی گاؤں چلی گئی اور میں نے رماناتھ کے بھوجنالیہ کی پناہ لی۔

بھوجنالیہ میرے مکان سے قریب تھا اور رماناتھ سے تھوڑی جان پہچان بھی تھی۔ رماناتھ کو جب میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ بولا ''ٹھیک ہے۔ ۵۰۰ روپیہ جمع کر دیجیے۔ دو سو مہینہ پورا ہونے پر دینا ہوگا۔ کل سے ڈبہّ بھیج دوں گا۔'' چند لمحہ رُک کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر پکارا اے ٹپورے ادھر آ۔''

وہ دوڑا دوڑا آیا۔ رماناتھ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''صاحب کے ساتھ جا کر گھر دیکھ لے۔ کل سے صُبح شام ڈبہّ پہنچانا ہے۔''

وہ میرے پیچھے چل کر گھر تک آیا۔ دروازے کا قفل کھولتے ہوئے میں نے کہا۔

''سویرے ٹھیک ساڑھے نو بجے ڈبہّ لانا۔ میں دس بجے دفتر کے لیے نکلتا ہوں۔''

''اور رات کو؟''

''بھوجنالیہ کب تک کھلا رہتا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''گیارہ بجے تک لیکن اگر مالک کے ٹرک والے دوست آ گئے تو کھانا پینا بارہ ایک بجے تک بھی چلتا ہے۔''

''تم ایسا کرنا۔ آٹھ بجے کے بعد دیکھ لینا۔ لائٹ جلتی نظر آئے تو ڈبہّ لے آنا۔''

''اچھا صاحب۔'' وہ جانے کے لیے مڑا۔

''سنو۔'' میں نے پکارا تو وہ رُک گیا۔ ''تمھارا یہ کیسا نام ہے؟ ٹپورے۔''

وہ خاموش رہا۔

''یہ نام ہے یا سرنیم؟''

''یہ مالک کا دیا ہوا نام ہے وہ سب کو ایسے ہی پکارتا ہے۔ مجھے ٹپورے کہتا ہے۔ راجیش کو چونیؔ، سلیم کو ڈمرو۔''

''میں تمھارا اصلی نام پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''منوج ہے میرا نام مگر بھوجنالیہ میں اس نام سے مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ ٹپورے ہی پوچھنا آپ۔''

پہلے دو تین دنوں تک تو میں منوج کی موجودگی میں ڈبہ کھولتا تک نہیں تھا۔ اس کے سامنے کھانا کھانے میں مجھے گھن آتی تھی۔

مگر جلد ہی اکیلا پن مجھے کاٹنے لگا۔ آفس میں کام کے دوران کچھ محسوس نہ ہوتا۔ آفس کے بعد کے دو ڈھائی گھنٹے بھی دوستوں کے ساتھ سیر وتفریح میں گزر جاتے مگر گھر لوٹتے ہی تنہائی عذاب جان ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ منوج سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

ایک روز میں نے اسے بٹھا کر پوچھا: ''تمھارے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''ماں نہیں ہے۔ پتا نے دوسری شادی کر لی ہے۔ وہی مجھے بھوجنالیہ میں چھوڑ گیا ہے۔''

''کبھی آتا ہے تم سے ملنے؟''

''ہر مہینے کی دو تاریخ کو میری پگار لینے آتا ہے۔ ادھر ابھی دو مہینے سے نہیں آیا۔''

''پگار تمھارا باپ لے جاتا ہے۔ تمھیں کیا دیتا ہے مالک؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے لگا تھا جواب میں وہ کہے گا پچیس روپے یا پچاس روپے۔ مگر اس نے کہا ''دیتا ہے آدھا پیٹ کھانا مار، جھڑکیاں۔ آدھی نیند اور نام کے لیے آرام۔''

''اوہ!'' مجھے بڑا رحم آیا اس بچے پر۔ ''ہاں صاحب۔ دن بھر تو پھرکی طرح گھومنا پڑتا ہے۔ رات کو گیارہ بجے بھوجنالیہ بند ہوتا ہے تو برتن دھونے ٹیبل کرسیاں پونچھنے اور فرش دھونے میں بارہ ساڑھے بارہ بج جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مالک کے پاؤں بھی دبانا پڑتے ہیں۔ اس کے بعد مجھے سلیم اور راجیش کو سونے ملتا ہے۔ نیند پوری نہیں ہوتی کہ سویرے پانچ بجے مالک کا پھُو گنگا ہمیں جگا دیتا ہے۔''

''اتنے سویرے بھلا کیا کام ہوتا ہے؟'' میں نے اس کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی۔

''بھٹی دہکانی پڑتی ہے۔ سویرے سے گراہک جو آنے لگتے ہیں۔''

''تم لوگ بولتے کیوں نہیں کہ پیٹ بھر کھانا دو۔ پوری نیند سونے دو۔'' میں نے اسے اُکسایا۔

وہ رہانسا ہو کر بولا ''سلیم بہت دُبلا پتلا ہے۔ کمزور بھی ہے۔ پیٹ بھر کھانا نہیں ملنے سے اسے چکر آتے ہیں۔ ایک دو مرتبہ اس نے پکوڑے اٹھا کر منہ میں ڈال لیے تھے۔ مالک نے مار مار کر ہڈیاں توڑ دیں۔ تین دن تک اسپتال میں بھرتی رہا۔ اس کی اماں بہت روئی تھی۔ میں جاتا ہوں صاحب۔ دیر ہو گی تو مالک مارے گا۔''

مزدوری کرنے والے دوسرے بچّوں کی طرح کی ہی کہانی تھی منوج کی۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ خاندان کی غریبی، خودغرضی اور بے اعتنائی انھیں اس دلدل میں گراتی ہے جہاں کام تو ان سے بڑوں کے برابر لیا جاتا ہے مگر مزدوری آدھی دی جاتی ہے۔ وہ بھی اکثر ان کے ہاتھوں میں نہیں ان کے جنم داتا یا پناہ دہندہ کے ہاتھوں میں۔ جانوروں کی سی زندگی ہوتی ہے ان کی۔ تمام دن کام کرنا، رات کو آدھی نیند سونا۔ اپنی مرضی کی نہیں، مالک کی مرضی کی زندگی اتنی آسان نہیں ہوتی کہ ہنس کر گزار لی جائے۔

ایک دن میں نے رمیش کے گھر رات کا کھانا کھالیا۔ منوج ڈبہ لے کر آیا تو میں نے کہا ''میں کھانا کھا آیا ہوں۔''

''واپس لے جاؤں۔'' اس نے بے حسی سے پوچھا۔

''واپس کیوں لے جاؤ گے؟ یہاں بیٹھو اور تم کھالو۔''

میں کہہ نہیں سکتا۔ کتنے شوق سے سیر ہو کر اس نے کھانا کھایا۔ ڈبہ لے کر جاتے وقت جن نظروں سے اس نے مجھے دیکھا میں ان کی زبان تو سمجھ گیا مگر اس کا بیان نہیں کر سکتا۔ رات بھر وہ ممنون آنکھیں میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑتی رہیں۔

دوسرے روز میں گھومتے گھومتے رماناتھ کے پاس پہنچ کر بولا۔ ''سات سو روپیہ لیتے ہو مگر پورا بھوجن نہیں دیتے۔ روٹیاں بھی کم ہوتی ہیں سبزی بھی ناکافی۔''

رماناتھ صفائی پیش کرتا ہوا بولا۔ کئی دنوں سے ڈبے میں بھوجن بچ کر آرہا تھا اس لیے میں نے کم بھیجنا شروع کر دیا۔''

''ان دنوں میرا پیٹ خراب چل رہا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کا عذر قبول کرتے ہوئے کہا۔

''اے چھورے!'' اس نے منوج کو پکار کر کہا ''آج سے صاحب کے ڈبہ میں آٹھ روٹیاں رکھنا۔ چھ روٹیاں میرے لیے کافی تھیں۔ دونوں وقت دو روٹی سبزی میں منوج کو دے دیتا۔ چار دن ہی میں اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

کچھ پہلے ہی سے میں آدرش وادی تھا، ٹی وی دیکھ کر نئے کام کرتا رہتا۔ دوسرے چینل میرے یہاں نہیں تھے۔ دوردرشن کے فلاحی پروگرام میری حوصلہ افزائی کرتے۔ ایک دن میں

نے درزی کو گھر بٹھا کر صوفہ سیٹ پر نئے کور چڑھوائے۔ منوج آیا تو میں نے درزی سے کہا ''بھیا، اس لڑکے کا ناپ لے لو۔''

شام تک درزی نے میرے پرانے پینٹ شرٹ سے منوج کے لیے دو نیکر اور دو شرٹ تیار کر دیے۔ منوج کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ میرے پاؤں پر گر کر بولا،

''آپ میرے پتا ہیں۔ صاحب آپ میرے پتا سے بڑھ کر ہیں۔'' میں نے اسے اٹھا کر کپڑے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

''میں انھیں پہن کر آپ کو دکھاؤں صاحب!'' وہ طفلانہ تجسّس سے بولا۔

''نہیں! ابھی نہیں۔ یہ لو روپے۔ سامنے نائی کی دکان میں جا کر اپنے بال اور ریچھ کی طرح بڑھے ہوئے ناخن کٹاؤ۔ پھر صابن سے جسم صاف کرو، بعد میں نئے کپڑے پہننا۔''

وہ سیلون کی طرف بھاگا۔ بال اور ناخن تو اسی وقت کٹا لیے۔ دیر ہوگئی جس کے لیے رمانا تھ سے مار بھی کھائی۔ نہانے کا وقت ملا رات گیارہ بجے کے بعد۔ نہا دھو کر اس نے نئے کپڑے پہنے اور سو گیا۔ خوابوں میں نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کی ہوگی اس نے۔ اسے اس بات کی قطعی خبر نہیں تھی کہ دو آنکھیں اسے مسلسل گھور رہی ہیں۔

دو جوڑی آنکھوں کو گھورتا تو اس نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور انھیں تسلی بھی دی تھی کہ فکر نہ کرو صاحب سے کہہ کر میں تمھیں بھی کپڑے بنوا دوں گا۔ ان چار آنکھوں میں طفلانہ رشک تھا۔ اُن دو آنکھوں میں ہوس کی پرچھائیاں تھیں۔

سویرے ڈبہ لے کر وہ آیا تو میں داڑھی بنا رہا تھا۔ وہ خاموش میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ صبح کے وقت وہ کبھی زیادہ دیر نہیں رکتا تھا کیونکہ بھوجنالیہ میں گراہکوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ''کچھ کہنا ہے؟''

وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا ''رات کو میں آپ کے برآمدے میں آ کر سو گیا تھا۔''

''کیوں؟'' مجھے حیرت ہوئی ''میں جب سویرے کی سیر کو نکلا تو تم دکھائی نہیں دیئے۔ کہاں سوئے تھے؟''

''پانچ بجے اُٹھ کر بھوجنالیہ چلا گیا تھا۔ سو یا برآمدے میں تھا۔''

''کوئی خاص بات تھی؟'' یوں ہی میں نے پوچھ لیا۔ میری نظر آئینے ہی پر تھی۔ وہ پھپک

کر روتا ہوا بولا۔ ''رات کو...... رات کو مالک مجھے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہ گندی باتیں کر رہا تھا۔ صاحب وہ گندی حرکت کرنا چاہتا تھا۔ میں بھاگ کر یہاں آ گیا۔''

میرے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ میں نے پلٹ کر منوج کی طرف دیکھا اور مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

منوج کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ میل کی پرتیں اُترنے سے گورا اُجلا رنگ نکل آیا تھا۔ پیٹ بھر خوراک ملنے سے گال بھر گئے تھے۔ گہری کالی آنکھوں اور کالے گھنے بالوں کی اپنی کشش تھی۔ مزدوری کرنے والے بچّوں کے استحصال کے مختلف طریقوں میں یہ فعل سب سے زیادہ گھناؤنا ہے۔ بڑوں کا جسمانی استحصال ہو، اسے میں سمجھ سکتا ہوں مگر معصوم بچّوں کے ساتھ ایسے سلوک کی خبریں پڑھ سن کر میرا روم روم سلگنے لگتا ہے۔ میں اس وقت اپنے آپ کو بڑا قابل رحم اور مجبور محسوس کرتا ہوں جب استحصال شدہ بچّوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر منوج کی بات الگ تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر منوج جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ میں نے کہا۔

''سنو! آج سے روزانہ یہیں آ کر سویا کرو۔''

منوج رات کو میرے برآمدے میں سونے لگا...... مگر اس کی مسکراہٹ کہیں کھو گئی تھی۔ کچھ سٹپٹایا سا رہتا ہمیشہ۔ ایک دن میں نے کریدا تو پھٹ کر بولا۔ ''میں بھاگ جاؤں گا صاحب۔''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ ضروری ہوا تو تمھارا کہیں اور انتظام کر دوں گا۔ پہلے مجھے بتاؤ۔ بات کیا ہے؟''

''وہی بات'' وہ نظریں نیچی کر کے بولا۔ ''مالک۔''

وہ بچّے جو عہدِ طفلی ہی میں لاپروائی یا نفرت کا شکار ہو کر روزگار کی بھٹّی میں جھونک دیئے جاتے ہیں، وقت سے پہلے جوان ہو جاتے ہیں۔ مگر قبل از وقت کی جدوجہد اور تجربے کی کمی انھیں بھٹکا بھی دیتی ہے۔

''میں تمھارے مالک سے بات کروں گا۔'' اسے تسلّی دی۔

''وہ مجھے مارے گا۔'' منوج نے سہم کر کہا ''اس نے کہا ہے کسی کو کچھ بتایا تو ٹانگیں توڑ کر گٹر میں پھینک دوں گا۔ میرے باپ کو تو میری فکر ہے نہیں۔ کہیں اور جا کر رہ لوں گا۔''

''وہاں کیا تمھارے مالک جیسے لوگ نہ ہوں گے؟ سنو منوج! مجھے بتائے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھانا۔ میں اپنے طریقے سے رماناتھ سے بات کروں گا۔''

مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ بقیہ روپیہ دینے میں بھوجنالیہ گیا۔ ادائیگی کی اور کہا ''ٹپورے کو بلا دو۔ اب وہ تمھارے ہوٹل میں کام نہیں کرے گا۔''

''مگر کیوں صاحب؟'' رماناتھ ہتھے سے اکھڑ گیا ''اس کا باپ اسے میرے پاس رکھ گیا ہے۔''

''اس کام کے لیے نہیں جو تم چاہتے ہو۔ پھر وہ تین مہینے سے آیا نہیں ہے۔ پتہ نہیں زندہ ہے یا مر گیا۔ تین مہینے کی پگار ٹپورے کو دو اور چھٹی کرو۔''

''مگر اس کا باپ...''

''آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔'' رماناتھ کا جملہ میں نے پورا نہ ہونے دیا۔

منوج رماناتھ کے چنگل سے چھوٹ گیا۔ یہ سب اتنی آسانی سے انجام نہ پاتا اگر رمیش درمیان میں نہ ہوتا۔ رمیش نے بس ایک مرتبہ آ کر رماناتھ کو ڈانٹ پلائی تھی اور دھمکایا تھا۔ رماناتھ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ علاقے کا تھانیدار میرا دوست ہے۔ کتنی ہی مرتبہ اس نے مجھے رمیش کے ساتھ پولیس جیپ میں گھومتا دیکھا تھا۔ ویسے رماناتھ کو بھی خاص اعتراض نہ تھا۔ غریب ماں باپ اپنے کئی بچّوں میں سے ایک دو کو دو وقت کے کھانے اور قلیل تنخواہ پر کہیں بھی نوکر رکھ دیتے ہیں۔ بچّہ پلتا رہتا ہے اور کمائی بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر گھر سے بھاگے ہوئے چھوکروں کی بمبئی میں سب سے بڑی پناہ گاہ یہ بھوجنالیہ اور ہوٹل ہی ہوتے ہیں۔

منوج کو میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ڈبہّ بند کر دیا۔ ہم دونوں مل کر کھانے بھر کو کچھ بنا لیتے۔ جلد ہی میں نے منوج کو پڑھانے لکھانے کا تہیہ کیا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔

منوج نے پڑھائی میں اتنی زیادہ دلچسپی دکھائی کہ مجھے اس کے لیے خاص طور پر کچھ انتظام کرنے کا سوچنا پڑا۔ میرے پڑوسی شرما صاحب کی بیٹی نیما ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ کھو بیٹھی تھی۔ ان دنوں صحت یاب ہو کر بیساکھی سے چلنے کی پریکٹس کر رہی تھی۔ ماں باپ دونوں ملازمت کرتے تھے۔ چھوٹا بھائی اسکول جاتا۔ شرما جی اکثر مجھ سے کہتے ''تنہائی میں تمام وقت روتی رہتی ہے'' میں نے منوج کو نیما کے حوالے کرتے ہوئے کہا ''نیما ایک طالب علم تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔ اسے پڑھاؤ۔ اس کی عمر کے تین چار برس جو ضائع ہو گئے ہیں ان کی تلافی

کر دو۔ میں تمھارا پورا ساتھ دوں گا۔"

ادھر سونا سے میں ہر دو دن میں فون پر بات کرتا تھا۔ وہ سب کچھ ٹھیک ہونے کی بات کہتی تب کہیں مجھے چین آتا۔ میں پندرہ دن میں اس سے مل بھی آتا تھا۔

اس دن بدھ تھا۔ میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ منوج فرش پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ میں نے پکارا۔ "منوج ادھر آ کر بیٹھو۔ یہ سیریل دیکھو۔ بہت اچھا سیریل ہے۔"

"صاحب، آج کل مجھے صرف پڑھائی کرنا اچھا لگتا ہے کیونکہ.." وہ کاپی پر جھکا جھکا بولا۔" کیونکہ آپ مجھے پڑھانا لکھانا چاہتے ہیں۔"

میرے دل میں اس کے لیے پیار اُمڈ آیا۔ میں نے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آ کر میری کرسی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کاپی لے کر ایک طرف رکھ دی۔ پھر اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا بولا۔ میں کہہ رہا ہوں نا... سیریل دیکھو۔"

میرا دل اندر سے نہ جانے کیسا ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی بچے کو پیار سے نہیں چھوا تھا۔ میری بھیگی آنکھوں کے سامنے ٹی۔ وی کے پردے کی تصویریں دھندلی ہو گئی تھیں۔ نہ جانے کیسے اور کب میری انگلیاں اس کی آنکھوں پر چلی گئیں۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ گویا ہم دونوں ہی ترسے ہوئے تھے۔ ایک ممتا کو ایک محبت کو۔ کچھ دیر بعد منوج نے آہستہ سے پوچھا "صاحب! کیا میم صاحب بھی مجھے اتنا ہی پیار کریں گی جتنا آپ کرتے ہیں؟"

میں نے اس کے چہرے کا رُخ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا "سونا ہے اس کا نام۔ سونے کی طرح ہی کھری اور سچی ہے۔ تم جانتے ہو سونے کو کھرا ثابت ہونے کے لیے کسوٹی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ آگ میں جلنا پڑتا ہے۔ سونا کو بھی بار بار امتحان دینا پڑ رہا ہے۔ تمھیں میں نے بتایا ہے نا کہ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے بس اسی لیے کبھی کبھی چڑھ جاتی ہے۔ غصہ کرنے لگتی ہے ورنہ دل کی بہت اچھی ہے۔ پھر اب تو جلد ہی اس کی گود بھر جائے گی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے اب تک۔"

"آپ نے کچھ تیاری نہیں کی صاحب؟" منوج نے پُر جوش ہو کر پوچھا۔ "وہ فلموں میں بتاتے ہیں نا۔ ویسے نہ کپڑے لائے نہ کھلونے؟"

"فلموں میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ حقیقت سے بہت دُور ہوتا ہے۔" میں نے توقف

کر کے کہا۔ ''ڈر لگتا ہے منوج۔ تین مرتبہ ہم نے اپنی خواہشوں کے تاج محل کو بھر بھرا کر گرتے دیکھا ہے۔ ہمارا بچہ اس دنیا میں آ جائے۔ میں پوری دنیا اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔''

اسی رات ساڑھے چار بجے فون آیا۔ سونا نے وقت سے پہلے بچّے کو جنم دیا جو گھنٹہ بھر بعد چل بسا۔ فون رکھ دینے کے بعد میرا دل چاہنے لگا کہ دیواروں سے ٹکرا کر سر پھوڑ لوں۔ چلاّ چلاّ کر روؤں مگر منوج کی موجودگی نے مجھے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ وہ میرے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اس امید سے کہ خوش خبری ملتے ہی اپنے صاحب کی خوشی میں شریک ہوگا مگر سب کچھ سمجھ کر خاموشی اختیار کر گیا تھا۔

میں نے سوٹ کیس میں چند کپڑے رکھے۔ منوج کو رمیش کے گھر چھوڑا اور سونا کے پاس پہنچ گیا۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا تھا کہ سونا کو کیسے سنبھالوں گا۔ اس وقت مجھے یہ کہاں پتہ تھا کہ ہماری بدنصیبی اتنی ہی نہیں ہے کہ ہم پھر ایک مرتبہ والدین بننے سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ اب ہم ہمیشہ کے لیے اس اعزاز کو حاصل کرنے کا موقع کھو بیٹھے ہیں۔

آپریشن ہوا تھا اور اسی دوران بدقسمتی سونا کو نظر لگا گئی۔ سونا ایک دم خاموش تھی نہ روئی چلاّئی نہ سر پیٹا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا کہ وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی، ''ششانک! دلاسے کا ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ میں نے اس تلخ حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ ہم قسمت سے نہیں لڑ سکتے۔ ممی پاپا، بھیا بھابی سے بھی کہہ دو کہ میں ایک بہادر عورت کی طرح حالات کا مقابلہ کروں گی۔ مجھ سے ہمدردی کوئی نہ جتائے۔''

اسپتال میں اس نے مجھ سے اپنے متعلق کوئی بات نہ کی، مجھ سے البتہ پوچھتی رہی کہ میں کھانا کہاں کھاتا تھا؟ گھر کی صفائی کون کرتا تھا؟ وغیرہ۔ میں نے کہہ دیا ''کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ایک مہینہ بھوجنالیہ سے ڈبہ منگوایا پھر منوج کو رکھ لیا۔ تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔''

پندرہ دن بعد میں سونا کے اصرار پر اسے ساتھ لے آیا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے سونا سے کہا ''تم آرام سے بیٹھو۔ میں منوج کو لے کر آتا ہوں۔ وہ گھر کی صفائی کر لے گا۔''

رمیش کے گھر سے منوج کو لے کر نکلا تو پوچھا میں نے ''منوج کیسے گزرے یہ دن؟''

''رمیش چاچا اور چاچی بہت اچھے ہیں۔ ان کی چھوٹی منّی سے میری بہت دوستی ہو گئی ہے۔ مگر صاحب آپ کی بہت یاد آتی تھی۔'' کہتے کہتے اس کے ہاتھوں کا گھیرا میری کمر کے

گردکس گیا۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔

سونا نے منوج کو دیکھا تو ہنس کر بولی ''یہ ہے منوج! تمھاری باتوں سے سمجھی تھی کہ منوج کوئی بڑی عمر کا آدمی ہے۔''

منوج نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''نمستے ممی جی! آپ کو دیکھنے، آپ سے ملنے کی بڑی چاہ تھی۔''

سونا تو سونا میں خود بھی دم بخود رہ گیا۔ سونا نے میری طرف دیکھا۔ منوج کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں سمجھ گیا سترہ دنوں سے جو آنسو رُکے پڑے تھے وہ اب روکے نہیں رکنے والے۔

منوج خود ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ موقع ملتے ہی میں رمیش کے گھر پہنچا۔ اس نے اقرار کیا۔ ''ہاں میں نے منوج سے کہا تھا کہ سونا بھابی کو ممی کہہ کر پکارے۔''

''مگر رمیش...... تم وہاں ہوتے تو دیکھتے سونا پر کیا اثر ہوا؟ میں نے اُداس ہو کر کہا۔

''ششانک۔ اس وقت بھابی کے لیے شاک ٹریمنٹ ہی مناسب ہے۔ تم دیکھنا اس کے مثبت نتائج نکلیں گے۔''

''مگر منوج کا باپ اسے لینے آ گیا تو؟ سونا کیا دوسرا شاک برداشت کر سکے گی؟'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منوج چاہتا کیا ہے۔

''وہ نہیں آئے گا۔''

''اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں نے منوج سے پتہ دریافت کر کے دو سپاہیوں کو اس کے گاؤں بھیجا تھا۔ منوج کی سوتیلی ماں نے تین ماہ قبل اپنے عاشق کے ساتھ مل کر شوہر کا خون کر دیا اور بھاگ گئی۔''

میں سکتے کی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ ''ششانک، میری معلومات کے مطابق منوج کا باپ ایک شریف آدمی تھا۔''

''اسی لیے بیٹے کو ہوٹل میں ملازم رکھ گیا تھا۔'' میں نے طنز سے کہا۔

'' بیٹے کی جان کی حفاظت کی خاطر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس پر غور کرو ششانک۔ شادی کے بعد تمھیں وقت پر اولاد ہو گئی ہوتی تو آج منوج کے برابر ہوتی۔ تم لوگ بے اولاد رہ کر تو زندگی نہیں بسر کرو گے۔ بچہ گود لو گے ہی، تو منوج کو کیوں نہ لے لو۔''

رمیش کی بیوی کوکلا چائے لے کر آئی اور رمیش کے نزدیک بیٹھ گئی۔رمیش نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔''اور اگر تم دوستی کا امتحان لینا چاہتے ہو تو میں اور کوکلا تمھیں اپنی چھوٹی منّی گود دینے کو تیار ہیں۔مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ششانک۔''

وہ رُک گیا۔میں خیالوں میں گم اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

''ششانک: خوبصورت عمارتیں بہت سے کلاکار بنا لیتے ہیں مگر تاج محل صرف ایک مرتبہ ہی بنتا ہے۔''

پولیسانہ مزاج والے پولیس افسر رمیش کا یہ شاعرانہ جملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''منوج کو مزدوری کی دلدل سے نکال کر ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے تم نے متعارف کرایا ہے۔وہ تمھارا شاہکار ہے۔اسے اپنی زندگی میں شامل کیوں نہیں کر لیتے؟''

میں نے رمیش کی تجویز سر آنکھوں پر قبول کر لی۔سونا نے بھی — آج میں کہہ سکتا ہوں۔ ہماری زندگی میں کوئی کمی نہیں ہے۔میں،سونا اور منوج تینوں اِک اکائی بن گئے ہیں۔ایک خوشحال خاندان۔ایک مکمل خاندان۔

○○

دھندے والی عورت

ہرش دیپ سنگھ نے، جیسا کہ اُس نے مجھے بتایا، دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں سردار لوگوں کو پہچاننے میں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔ سب سردار مجھے لگتے ہی ایک جیسے ہیں۔ قد کاٹھی صحت بھلے ہی الگ - و، نظر پہلے چہرے پر جاتی ہے اور وہاں آدھا حصّہ داڑھی نے گھیرا ہوا ہوتا ہے۔ ہرش دیپ کو میں نے دیکھا تھا، پہچانا نہیں تھا۔

افتتاحی تقریب کے بعد چائے کے وقفے میں میرے نزدیک آ کر وہ بولا: ''ہلو! مجھے پہچانا، ہم دو سال پہلے منالی میں ملے تھے۔''

میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کر کے حال چال پوچھا تو بولا: ''پاپا جی بزنس میں لگانا چاہتے تھے۔ من لگا نہیں۔ اپنا تعلیمی ادارہ ہے۔ لکچرر بن گیا ہوں۔''

احمد آباد میں یہ ریفریشر کورس ہو رہا تھا۔ پہلے جو میرا روم پارٹنر تھا، اُسے چنئی سے آنے والا ایک دوست مل گیا۔ وہ اُدھر چلا گیا تو ہرش دیپ میرے ساتھ آ گیا۔ ہم دوست نہیں تھے۔ بس کچھ دِنوں کی شناسائی تھی جو آخیر آخیر میں کڑواہٹ میں بدل گئی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ چاہا کہ ہرش دیپ سے پوچھوں 'سونا کیسی ہے؟' مگر پوچھ نہ سکا۔ بار بار یہ خیال روک دیتا تھا کہ ہرش دیپ بھولا نہیں ہوگا کہ کبھی میں بھی سونا کے پیچھے تھا۔

میں چنڈی گڑھ ایک شادی میں گیا تھا۔ سیاحوں کا ایک گروپ منالی جا رہا تھا۔ میں بھی ٹور میں شامل ہو گیا۔ آرگنائزر بھیکا سنگھ کے علاوہ سترہ افراد تھے۔ سات افراد پر مشتمل ایک خاندان، چار پر مشتمل دوسرا، ایک نو بیاہتا جوڑا اور ہم چار تنہا بندے۔ منڈی پہنچتے پہنچتے ہم سب ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ پہلی فیملی کوٹہ، راجستھان سے آئی تھی، دوسری آگرہ سے۔ نو بیاہتا جوڑا فرید آباد کا تھا۔ پانڈے اور کوثر حسین یوپی سے، میں مہاراشٹر سے اور ہرش

دیپ چنڈی گڑھ سے۔

منڈی پر کچھ دیر کے لیے بس رُکی تو اُٹھارہواں سیاح ہم میں شامل ہوا بلکہ شامل ہوئی۔ سنہری ٹی شرٹ اور کالی جینس میں ملبوس، سنہری زلفوں کی چھاؤں میں وہ سرتاپا سنہری نظر آ رہی تھی۔ مغربی سیاحوں کی طرح پشت پر سفری بیگ، آنکھوں پر کالا چشمہ، اکیلی، بالکل اکیلی بس میں چڑھی اور کوثر حسین کے بازو کی خالی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کوثر حسین کسمسا کر رہ گیا۔

منالی پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ گیسٹ ہاؤس میں سات افراد والی فیملی دو کمروں میں، چار افراد والی ایک کمرہ میں منتقل ہوئی۔ نو بیاہتا جوڑے کو ایک کمرہ ملا۔ مجھے پانڈے کے ساتھ کمرہ شیئر کرنا پڑا۔ ہرش دیپ اور کوثر حسین ایک کمرہ میں تھے۔

بھیکا سنگھ نے اُسے وی آئی پی کمرہ الاٹ کیا۔ کمروں میں منتقل ہونے کے دوران اُس نے خود کو متعارف کرایا: ''آئی ایم سونالی سنگھ۔ میں سونالی سنگھ ہوں... بٹ آف کورس... آپ مجھے سونا کہہ سکتے ہیں۔ چنڈی گڑھ میں Law کی اسٹوڈنٹ ہوں... منڈی میں گھر ہے...''

سویرے یوگا کی کلاس میں دو معمّر خواتین کے سوا ہم سب شریک تھے۔ بھیکا سنگھ اوشو کا پرستار تھا۔ ان کے آشرم میں کئی دن رہ چکا تھا۔ یوگا کے نام پر کیسٹ لگا کر سب تھرکنے لگے۔ رفتہ رفتہ موسیقی کی لے تیز ہوئی تو رقص میں بھی تیزی آ گئی۔ اس خرافات سے تنگ آ کر میں ایک طرف جا بیٹھا اور دَم بخود اُسے دیکھتا رہ گیا۔ سونالی عرف سونا میرے سامنے تھی۔ سرخ لبادے میں ملبوس، آنکھیں بند کیے دیوانہ وار رقص کیے جا رہی تھی۔ ایک انجانی کشش مجھے اپنے آپ سے بے خود کرنے لگی۔

بریک فاسٹ لیتے ہوئے سونا نے خواتین سے دس منٹ گفتگو کی پھر ہم نوجوانوں میں شامل ہوگئی۔ کرتی بھی کیا؟ نو بیاہتا جوڑا اپنے میں گم تھا، فیملی والے فیملی میں گم تھے۔ کمپنی ہم لوگوں کو چاہیے تھی... کمپنی سونا کو بھی چاہیے تھی۔

روہتانگ پاس جانے کے لیے سب بس میں سوار ہونے کو دوڑے۔ سونا نے دوڑ کر فرنٹ سیٹ پر قبضہ جمایا اور پکارا ''پانڈے جی، ادھر آ جایئے۔''

پانڈے جی باچھیں پھاڑے دوڑے۔ ہم دونوں منہ دیکھتے رہ گئے۔ کوثر حسین بلند و بالا پہاڑوں کو تک رہا تھا۔ بعد میں پانڈے جی نے بتایا ''بڑی بولڈ لڑکی ہے۔ سیاست، دہشت

واد، سیکس ہر موضوع پر بول سکتی ہے۔''

ہرش دیپ سنگھ کا تجربہ مختلف تھا۔ وہ واپسی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تمام راستہ وہ اُسے اُردو کے عشقیہ اشعار سناتی آئی تھی۔

گروپ کی خواتین سے وہ دور بھاگتی تھی اور وہ لوگ بھی اُسے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھاتیں۔ دبی زبان سے فقرے کستیں: ''خدا جانے کیسے ماں باپ ہیں جو جوان بیٹی کو یوں کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ کل دن بھر اس سردار جی کے ساتھ تھی... آج دیکھیں نظرِ کرم کس پر ہوتی ہے۔''

جلد ہی پانڈے جی آؤٹ ہو گئے۔ اُتر پردیش کا، بیرکی اِلّی کی طرح کا یہ لجلجا وکیل، ہم چاروں کے درمیان بڑی بے باکی سے اپنی پسند کا اظہار کرتا رہا، مگر پہلے دن کے بعد اُسے لفٹ نہیں ملی۔ کوثر حسین الگ ہی مٹی کا بنا ہوا تھا... ادیب تھا۔ پہاڑی پس منظر میں ایک ناول لکھ رہا تھا۔ اُسے قدرتی مناظر کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ رہ گئے میں اور ہرش دیپ سنگھ!

ایک روز سونا نے مجھے کمپنی دی۔ ہم بس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے، برف میں ساتھ ساتھ کھیلے، ہر جگہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومے... شام کو میں نے اُسے شاپنگ کرائی۔ مگر میں شادی شدہ تھا۔ میری کچھ حدیں تھیں جبکہ ہرش دیپ کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ بزنس مین باپ کا اکلوتا بیٹا، بانکا خوبرو جوان، غیر شادی شدہ۔

سونا نے کئی مرتبہ ہم لوگوں کے سامنے کہا تھا کہ اُس کے ڈیڈی نے، جو فوج میں کرنل ہیں ایک آرمی آفیسر کو اُس کے لیے پسند کر لیا ہے، مگر اس جملے کے بعد وہ فوراً یہ بھی کہہ دیتی تھی کہ ''میں نے ابھی رضامندی نہیں دی ہے۔ ڈیڈی نے مجھے اتنی آزادی دی ہے تو اپنے شریکِ حیات کا انتخاب بھی میں خود ہی کروں گی۔''

ہرش دیپ اسی مغالطے میں رہ گیا۔ پیراگلائڈنگ کلب میں تو ان دونوں کی نزدیکیاں دیکھ کر ہم سب دنگ رہ گئے۔ خواتین نے سخت اعتراض کیا مگر بھیکا سنگھ نے 'یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے' کہہ کر قطعی نوٹس نہ لیا۔

میں نے ہرش دیپ کو شرافت کی حدود میں رہنے، اُسے سمجھانے کی ایک دو مرتبہ کوشش کی مگر اُس نے مجھ سے بات بند کر دی۔ کڑی نظروں سے گھور کر وہ مجھے ہی خاموش رہنے کو کہہ دیتا۔

ریفریشر کورس کے اختتام سے ایک روز پہلے میں نے آخر پوچھ ہی لیا: ''ہرش دیپ! سونا

کیسی ہے؟''

''سونا؟'' اُس نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے سونالی سنگھ...وہ منالی میں...'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''میری شادی دہلی کی کویتا سے ہوئی ہے۔ ہماری ایک بیٹی بھی ہے...جوہی۔'' اُس نے غیر متعلق سا جواب دیا۔

میں اپنے آپ کو روک نہ سکا، خواہ مخواہ بول گیا: ''اوہ اچھا...وہاں منالی میں ایسا لگتا تھا... میرا مطلب ہے...''

''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا'' ہرش دیپ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''میں خود بھی وہی سمجھ رہا تھا جو دوسرے سمجھ رہے تھے...مگر میں بُری طرح ٹھگا گیا۔ وہ سب فریب تھا۔ بھیکا سنگھ کا اسٹنٹ (Stunt)۔''

''اسٹنٹ! بھلا کیسے؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''ذرا سوچئے...کسی خاص ٹور میں ایک ایسی جوان، خوبصورت لڑکی شامل رہے جو تنہا نوجوانوں کو کمپنی دے تو ٹورسٹ اُسے ترجیح نہ دیں گے؟ بھیکا سنگھ کی چاندی ہو جاتی ہے...خود وہ کافی کچھ تحفے تحائف کی شکل میں حاصل کر لیتی ہے۔''

''مگر ہرش دیپ! کون سے والدین اپنی لڑکیوں کو ایسے رکیک مقصد کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دیں گے؟ وہ خود Law کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کی ماں لکچرر اور ڈیڈی فوج میں کرنل تھے...''

''سب بکواس تھی وہ۔ بھیکا سنگھ کے ہر ٹور میں ایسی ایک لڑکی شامل رہتی ہے۔''

''ہر ٹور میں؟ نہیں ہرش دیپ یہ ممکن نہیں۔ اتنی لڑکیاں وہ لاتا کہاں سے ہے؟'' مجھے نہ جانے کیوں یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہرش دیپ نے ایک لمحے کو میری طرف غور سے دیکھا پھر سر جھکا کر بولا: ''آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ لڑکیاں ایک خاص جگہ سے ہائر کی جاتی ہیں۔ سونالی بھی دھندے والی عورت تھی۔''

OO

ہلکے گہرے رنگ

آج پھر چھوٹوں سے شروع ہو کر جنگ بڑوں تک پہنچی اور خطرناک صورت اختیار کر گئی۔
دونوں نے اعلان کر دیا ''اُوپر والے اُوپر رہیں گے، نیچے والے نیچے۔ اوپر والوں کا نیچے والوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا — نیچے والے اُوپر والوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے۔''
''بچّوں کو کیسے روکو گی؟'' خدیجہ خاتون نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''روکیں گے، زبردستی روکیں گے۔ نہ مانیں گے تو باندھ کر رکھیں گے۔ ہمارے بچّوں کو ان کے بچّے ستاتے ہیں، مارتے ہیں، کھیلنے نہیں دیتے۔ ہر چیز پر قبضہ کر لیتے ہیں۔'' چھوٹی نے بڑی کے بچّوں کی زیادتیوں کی فہرست سنا دی۔
''تمھارے دونوں فتنے کیا کم ہیں؟ ہم ہر بات میں لحاظ کرتے ہیں تو تم سر چڑھی جاتی ہو۔'' بڑی نے بھی تیز ہو کر کہا۔
''ایسی ہی لحاظ کرنے والی ہیں تو اپنے بچّوں کو تہذیب و شرافت کیوں نہیں سکھاتیں؟'' چھوٹی نے طعنہ دیا۔ ''جب دیکھو ہمارے بچّوں کو نوچتے کھسوٹتے رہتے ہیں۔''
''ہم تو منع کرتے ہیں مگر بچّے مانتے ہیں کسی کی۔ اب کسی کے کہنے سے ان کی جانیں تو نہیں لے لیں گے۔'' بڑی نے نپا تلا جواب دیا۔
''چلو اوپر۔'' چھوٹی نے فراز اور انعم دونوں کی بانہیں پکڑیں۔ ''اور خبردار! کبھی نیچے آئے تو ٹانگیں توڑ دیں گے۔''
''ٹانگیں توڑ دیں گی تو پھر ہم چلیں گے کیسے؟ کھیلیں گے کیسے؟ اسکول کیسے جائیں گے؟'' فراز نے سوال پر سوال جڑ دیئے۔

ماحول اتنا گرم نہ ہوتا تو فراز کے ان برجستہ سوالوں پر خدیجہ خاتون اُس کی بلائیں لیتیں مگر اس وقت وہ گم سم بیٹھی ہوئی تھیں۔

ماں کے کھینچنے کے بعد بھی فراز جگہ سے نہ ہلا تو چھوٹی غصّے سے بولی: ''امّی جان، آپ ہمارے ساتھ اوپر چل کر رہیں۔ یہ آپ کے بغیر نہیں رہے گا۔''

''نہیں۔'' بڑی نے سختی سے کہا۔ ''امّی جان نیچے ہی رہیں گی۔ تمھارا گھر تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے بنا ہے، نیچے کا گھر ہی اصلی گھر ہے۔''

''دیکھو سمجھ سے کام لو۔'' خدیجہ خاتون نے کہا۔ ''سہیل اور شرجیل کو آ جانے دو۔''

چھوٹی نے اُن کی بات پر دھیان دیئے بغیر کہا: ''امّی جان، آپ کو ہماری قسم ہے جو آپ نے انکار کیا۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گی، اُوپر نئے گھر میں۔''

''قسم دینا ہمیں بھی آتا ہے۔'' بڑی نے رونے پر آتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہم دیں گے نہیں۔ ہمارے بچّے بڑے ہیں۔ اُن کا زیادہ حق ہے دادی پر۔''

''یہی تو... یہی تو۔'' چھوٹی نے بات پکڑ لی۔ ''اِسی لیے تو امّی جان آپ کے بچّوں کی طرفداری کرتی ہیں۔ غلطی ہونے پر ہمارے بچّوں ہی کو قصوروار ٹھہراتی ہیں۔''

''دادی امّی نے ہمیں ڈانٹا نہ کبھی مارا۔'' انعم نے فوراً کہا۔

''ہمیں بھی... ہمیں بھی۔'' فرحان اور ایاز ایک ساتھ بولے۔

چھوٹی جھلاّئی: ''ابھی تھوڑی دیر پہلے روتے روتے کون آیا تھا ہمارے پاس کہ دادی امّی نے مارا ہے۔''

''ہم آئے تھے ہم۔'' فراز شرارت سے ہنس کر بولا۔ ''اور جھوٹ موٹ رو رہے تھے... دادی امّی کبھی مارتی بھی ہیں بھلا...'ایک طمانچہ ماروں گی' بول کر ہاتھ اُٹھاتی ہیں اور پھر چٹ سے پیار کرتی ہیں۔''

خدیجہ خاتون نے منہ پھیر لیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

چھوٹی بولی: ''اور کل بڑے ابا نے تمھارے پاؤں پر پاؤں نہیں رکھ دیا تھا۔ کیسے روتے بلکتے ہمارے پاس آئے تھے۔ بھول گئے؟''

''بڑے ابا نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ ہم سیٹی بجا رہے تھے تو ہمیں دھمکانے کے

لیے ذرا پاؤں رکھ دیا تھا۔" فراز نے چپ رہنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔

"پھر تم روئے کیوں؟ ہمارے پاس آ کر شکایت کیوں کی؟" ہر وار اُلٹا پڑتا دیکھ کر چھوٹی چڑ گئی۔

"ہم چلاّ کر روتے ہیں تو بڑے ابا گھبرا جاتے ہیں۔ فوراً اسکوٹر پر بٹھا کر گھمانے لے جاتے ہیں۔" فراز نے آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی۔" خدیجہ خاتون نے معاملہ رفع دفع کرنے کی غرض سے کہا۔ "کیا چھوٹی چھوٹی باتیں نکال کر بیٹھی ہو۔ اُس روز شرجیل نے پانی پھینکنے اور کپڑے گیلے کرنے پر فرحان کو دو تین طمانچے لگا کر اندر بھیجا تھا۔ بڑی نے کچھ کہا؟ بس گیلے کپڑے اُتار کر اس کا بدن سکھاتے ہوئے اتنا ہی بولی تھی "کیسے نادان ہیں چچا، اتنے پیارے، اتنے چھوٹے سے بچے کو مارتے ہیں۔ اپن دادی امی کو ان کا نام بول دیں گے۔"

"آپ ہمیشہ ان ہی کی تعریف کرتی ہیں... ان ہی کو اچھا کہتی ہیں۔" چھوٹی روتی ہوئی دونوں بچوں کو اُوپر گھسیٹ لے گئی۔

خدیجہ خاتون کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں؟ کیسے گھر کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالیں۔ کہنے کو صرف چار بچے تھے گھر میں... مگر ان کی وجہ سے گھر کے چار بڑوں میں ہمیشہ تنا تنی چلتی۔ کھیلتے کھیلتے لڑ پڑتے اور پھر رو رو کر گھر سر پر اُٹھا لیتے۔ خدیجہ خاتون ہر لمحہ نگاہ رکھتیں مگر بچے ان سے زیادہ تیز تھے۔ جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے آپس کے جھگڑے بھی بڑھ رہے تھے۔ پہلے بڑی چھوٹی ایک دوسرے کے بچوں کو الزام دینے لگیں پھر سہیل شرجیل بھی ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے۔

یہ سب کچھ ابھی ایک دو سال ہی سے ہونے لگا تھا ورنہ ان کا گھر تو خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ ان بچوں میں وہ اپنے شوہر کی دائمی مفارقت کا غم بھول گئی تھیں۔ انعم میں تو سب کی جان تھی۔ ہرے کنچے جیسی آنکھوں، سنہری بالوں والی خوبصورت گڑیا کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے سب۔ شرجیل تو اُسے بے پناہ چاہتا تھا۔ وہ بھی چچا کی دیوانی تھی... انھیں وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اتوار کے روز سب لوگ سہ پہر کی چائے پی رہے تھے۔ شرجیل ایک کاغذ لے کر آیا۔ انعم کے انگوٹھے پر پین سے سیاہی لگائی اور بولا: "سب لوگ دیکھ لیں۔ انعم ابھی اس کاغذ پر انگوٹھا لگائے گی۔"

''یہ کیا ہے؟'' خدیجہ خاتون نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''اقرار نامہ ہے۔''

''کیسا اقرار نامہ؟''

''پہلے اسے انگوٹھا لگا لینے دیں، پھر بتاتا ہوں۔''

انعم دو سال کی تھی تب۔ بڑی احتیاط سے شرجیل نے اس کے انگوٹھے کا نشان کاغذ پر لیا پھر اُسے گود میں بٹھا کر رومال سے انگلی کی سیاہی پونچھتا ہوا بولا: ''اِس اقرار نامے میں لکھا ہے — 'میں انعم اقبال بنت سہیل اقبال، بہ ہوش و حواس اعلان کرتی ہوں کہ آج سے میں اپنے چچا شرجیل اقبال کی بیٹی بن گئی ہوں... اور ہمیشہ ان ہی کی بیٹی رہوں گی۔ میرے والد، والدہ کا مجھ پر کوئی حق نہ ہوگا'... چلئے بھائی جان، بھابی، امّی آپ تینوں اس پر بطور گواہ دستخط کریں۔''

سہیل اور بڑی نے تو مسکراتے ہوئے دستخط کر دیئے مگر خدیجہ خاتون ہاتھ اُٹھائے خدا سے دُعا مانگنے میں مصروف ہوگئیں... ''اللہ! میرے گھر کی خوشیوں کو نظرِ بد سے بچانا۔''

شرجیل کی شادی ہوئی۔ فراز پیدا ہوا تب تک شرجیل کا یہ عالم تھا کہ کہتا تھا... 'اس گھر میں بیٹی بس ایک ہی رہے گی۔ اس کے حصّے کا پیار بٹنا نہیں چاہیے'... اور واقعی اُس کے یہاں دوسرا بھی بیٹا ہی ہوا۔

بڑی کا فرحان چاروں بچّوں میں سب سے زیادہ شیطان تھا... ایاز، فراز کے بال نوچنا اُسے بے حد پسند تھا۔ ایاز اُس سے بڑا گھبراتا۔ وہ سائیکل پر بیٹھا ہوتا اور فرحان آجاتا تو فوراً کہتا: ''بھائی، سائیکل پر بیٹھئے؟ آؤ بیٹھو'' اور فوراً اُتر کر کھڑا ہو جاتا۔ کوئی کھلونا اُس کے ہاتھ میں ہوتا تو فرحان کو دیکھتے ہی نیچے رکھ دیتا یہ سوچ کر کہ... شاید اُسے اسی کھلونے کی ضرورت ہو۔ فراز فطرتاً سیدھا تھا۔ فرحان کی داداگیری کو نظر انداز کرتا رہتا مگر ایک آدھ بار جم کر اُس کی پٹائی بھی کر دیتا۔ بچّے بچّے ہی تھے، ایک سائیکل پر بیٹھتا تو دوسرے کو بھی اُسی وقت سائیکل کی یاد آتی۔ ایک ہوائی جہاز اُڑاتا ہے تو دوسرا اپنی موٹر چھوڑ کر اُدھر ہی لپکتا۔ فرحان بال مٹھی میں جکڑ لیتا۔ فراز گھونسے لگاتا۔ بڑی چھوٹی دوڑتیں۔ اُنھیں الگ کرتیں۔ بچّے ایک طرف روتے، چھوٹی بڑی دوسری طرف بڑبڑاتیں...

بڑی سات بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ مشترکہ خاندان تھا۔ دوسروں کو کچھ

دینا، دوسروں کے لیے کچھ چھوڑ دینا، کچھ باتوں کو نظرانداز کرنا جانتی تھی اس لیے بچّوں کی اِن چھوٹی موٹی لڑائیوں کو زیادہ اہمیت نہ دیتی مگر چھوٹی کے بچّوں کو کسی نے ہاتھ لگایا کہ اُدھر اُس کا رونا شروع ہو جاتا۔ والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ناز و نعم میں پلی بڑھی اس لڑکی کو درگزر کرنا، ایڈجسٹ کرنا تو آتا ہی نہ تھا۔ ویسے دل کی بُری نہ تھی۔

آج تیر کمان سے نکل ہی گیا۔ چھوٹی نے اپنی گرہستی الگ کر لی۔ سہیل، شرجیل کی کچھ نہ چلی۔ سب اپنے اپنے خول میں سمٹ گئے۔

دو روز گزرے تھے کہ فرحان میاں بے چین ہو گئے۔ دادی سے پوچھا: ''دادی امّی یہ فراز، ایاز نیچے کیوں نہیں آتے؟''

خدیجہ خاتون خاموش رہیں۔

''ہم اُوپر جائیں؟''

''نہیں۔'' خدیجہ خاتون نے سختی سے کہا۔ ''تم انعم کے ساتھ کھیلو۔''

''ہم اُوپر جائیں گے۔'' فرحان نے ضد کی۔ ''فراز کے ساتھ کھیلیں گے۔''

''فراز کے ساتھ کھیلو گے یا اُسے مارو گے۔ اسی لیے وہ نیچے نہیں آرہے کہ تم انھیں مارتے ہو۔'' بڑی نے غصّے سے کہا۔ ''اب وہ تمھارے ساتھ بات نہیں کریں گے، نہ کبھی کھیلیں گے۔''

''واہ!'' انعم بولی۔ ''فراز اور ہم تو اسکول میں خوب کھیلتے ہیں۔''

''کھیلتے ہوں گے۔ گھر میں تو لڑتے ہو۔ یہ سب فرحان کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے تمھاری چھوٹی امّی فراز، ایاز کو نیچے نہیں بھیجتیں۔'' بڑی نے فرحان کو مخاطب کیا۔

''فراز تم سے بڑا ہے۔ تم چھوٹے ہو کر اُسے مارتے ہو۔ یہ اچھی بات ہے بھلا۔''

''اب نہیں ماریں گے فراز کو۔'' فرحان نے سادگی سے کہا۔ ''ایاز چھوٹا ہے، اُسے تو مار سکتے ہیں نا۔''

''ایاز کو ماریں گے... گویا مارکاٹ کے بغیر تمھارا کام نہیں چلتا... رہو اب اکیلے... کھیلو جا کر محلّے کے بچّوں کے ساتھ۔'' بڑی بڑبڑاتی ہوئی کام میں مصروف ہوگئی۔

اُدھر فراز نے ماں کی جان آفت میں کر رکھی تھی۔ اسکول سے لوٹ کر بولا: ''امّی، آج ہم نے اور انعم نے (لاکھ بولنے کے باوجود انعم کو آپی نہیں کہتا تھا) جھگڑا جھگڑا کھیل کھیلا؟''

''کیسا کھیل ہے یہ؟'' چھوٹی کو اندازہ نہیں تھا کہ کیسا دھما کہ ہونے والا ہے۔

''ہم، آپ بنے یعنی چھوٹی امّی اور انعم بڑی امّی بنی۔ پھر ہم دونوں نے جھگڑا کیا۔''

''اسکول میں؟ سب بچّوں کے سامنے؟'' چھوٹی پانی پانی ہوگئی۔

''اور کیا۔'' فراز نے سادگی سے کہا۔ ''وہ جو عمّار ہے نا وہ اپنے ابّا کی سگریٹ پینے کی نقل کرتا ہے۔ منیرہ اور سعیدہ اپنی امّی اور دادی کی لڑائی کا کھیل کھیلتی ہیں۔ اپنے گھر میں لڑائی ہوئی تو ہم نے اپنے گھر کی لڑائی کی نقل کر کے بتائی۔''

چھوٹی پریشان ہوگئی۔ شرجیل کو بتایا تو وہ بولا: ''بچّے وہی کریں گے جو دیکھیں گے۔ یہ تمھیں اور بھابی کو سوچنا چاہیے۔''

''مگر جب ہم نے الگ ہونے کی بات کی تھی تب تو آپ نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔'' چھوٹی شرجیل کی بدلی ہوئی نگاہیں دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

''میری عقل ماری گئی تھی اور کیا؟'' شرجیل ماتھا ٹھونک کر بولا۔ ''تمھاری ہر دَم کی شکایتوں سے تنگ آ کر میں نے کہہ دیا تھا کہ باندھ کر رکھو اپنے پلّو میں، نہ بچّے لڑیں گے نہ تمھارا دماغ گرم ہوگا۔''

چھوٹی رونے لگی۔ بولی: ''جس روز ایاز کا سر پھوٹا تھا، آپ ہی نے تو ہمارے دماغ میں یہ بات ڈالی تھی کہ بچّوں کو الگ الگ رکھو۔''

''ہاں، سر ایاز کا پھوٹا تھا، دماغ میرا خراب ہوا تھا۔ بیٹے کی محبت میں وقتی طور پر اندھا ہو گیا تھا۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ فرحان نے جان بوجھ کر تو اسے سیڑھی سے دھکیلا نہ ہوگا۔ بچّے ہیں، گیند کے لیے چھینا جھپٹی کر رہے ہیں... ابھی لڑے ہیں تھوڑی دیر میں پھر ایک ہو جائیں گے۔''

''آپ ہی ہمارا ساتھ نہیں دیں گے تو ہم کیا کریں گے؟ سب ہمیں الزام دیں گے۔''

''نہیں۔ تمھارا شوہر ہوں۔ دوسروں کے سامنے تو تمھارا ساتھ دوں گا... مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ بھائی جان کبھی غلط بات میں بھابی کا ساتھ نہیں دیتے۔ یاد نہیں، الگ ہونے کی کتنی مخالفت کی تھی انھوں نے۔ تمھیں بھی تو سمجھایا تھا۔'' شرجیل جو بولتا تھا، صاف صاف بول دیتا تھا۔

''بھابی کو سمجھایا ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔''

''بھابی کو تو بہت ڈانٹا تھا کہ تم بڑی ہو، تمھیں چھوٹی کو لے کر چلنا چاہیے... اور میرے

خیال میں اس میں بھابی کا اِتنا قصور نہیں...''

''...جتنا ہمارا ہے...'' چھوٹی نے جملہ پورا کر دیا اور رونے لگی...

فجر کو خدیجہ خاتون نے فرض پڑھ کر سلام پھیرا تو ان کی نظر کچن کے دروازے کی طرف اُٹھ گئی — وہاں فراز کھڑا تھا۔

اُنھوں نے نظریں ہٹالیں اور جلدی جلدی فرض کے بعد کی آیۃ الکرسی پڑھنے لگیں... دِل نہ مانا۔ کنکھیوں سے دیکھا۔ فراز بڑے پُرشوق انداز میں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خدیجہ بیگم نے بازو میں بیٹھ کر نماز پڑھتی بڑی کو فراز کی موجودگی سے آگاہ کیا۔ اس نے بھی کنکھیوں سے دیکھا۔

دونوں کے دِلوں میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ زبان پر آیتیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ بڑی سوچ رہی تھی...'اُسے چھوٹی نے آنے کیسے دیا؟'

خدیجہ خاتون سوچ رہی تھیں...'نیچے کا دروازہ تو وہ کھلا چھوڑ آئی تھیں۔ اُوپر کا دروازہ کس نے کھولا ہوگا؟'

چاروں بچّے اکثر ہی چھپا چھپی کھیلا کرتے۔ انعم، فرحان اور ایاز تو آرام سے چھپ کر بیٹھ جاتے اور چور پکڑے جانے کا اعلان ہونے پر ہی پناہ گاہ سے باہر نکلتے۔ فراز کو صبر نہ آتا۔ ذراسی دیر ہوتی اور وہ کود کر سامنے آجاتا۔ ''ہم یہاں چھپے ہیں۔ ہمیں ڈھونڈو نا۔''

اس وقت بھی وہ یہی سمجھا کہ دادی اور بڑی امّی کی نظریں اُس پر نہیں پڑیں، بے تاب ہو کر بول اُٹھا: ''ارے! ہم کو تو کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ ہم کب سے یہاں کھڑے ہیں۔''

خدیجہ خاتون کے دِل کو جیسے کسی نے مسل دیا۔ مڑ کر بے ساختہ ہاتھ پھیلا دیے۔ فراز دوڑ کر اُن کی گود میں سما گیا۔ اُنھوں نے اتنی زور سے اُسے بھینچا کہ وہ چلا پڑا... ''دادی امّی ہم دَب رہے ہیں۔ ہم دَب رہے ہیں۔''

''امّی جان، چھوڑیے اُسے۔'' بڑی نے آگے کھسک کر اُن کی گرفت ڈھیلی کی۔

خدیجہ خاتون فراز کو بے تحاشہ پیار کرتی ہوئی بولیں: ''تو صبح صبح کیسے آ گیا میرے کلیجے کے ٹکڑے؟''

''امّی ابّو سو رہے ہیں۔ ہم نے کُرسی پر چڑھ کر دروازہ کھولا اور آ گئے آپ کے پاس۔ ہم

اب بڑے ہو گئے ہیں دادی امّی۔" فراز نے پھیل کر دادی کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔ مگر بیٹے اتنے بڑے نہ ہو جانا کہ بوڑھی دادی کی نظریں تمھیں دیکھنے کو ترس جائیں۔" خدیجہ بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"امّی جان!" بڑی نے اُن کا دھیان شرجیل اور چھوٹی کی طرف کرایا جو خاموشی سے آ کر دروازے میں کھڑے تھے، پھر بولی: "آیئے نا بھائی جان... آؤ چھوٹی۔"

"نہیں۔" خدیجہ بیگم سختی سے بولیں۔ "جاؤ تم... اُوپر اپنے مکان میں جاؤ۔ فراز میرے پاس رہے گا۔ میں اب ہرگز اُسے تمھارے حوالے نہیں کروں گی۔"

"نہ کریں۔" شرجیل اور چھوٹی آ کر اُن کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ "ہم تو خود آپ کے حوالے ہونے آئے ہیں۔"

OO

بدلی ہوئی لڑکی

سعید کو جب لارا کے سلسلے میں ریحان کا فون ملا تو وہ گھبرا گیا...دانت پیس کر بولا: ''احمقوں کے شہنشاہ! جانتا ہے تو کیا کہہ رہا ہے؟''

''خوب جانتا ہوں۔ اُس کی مدد کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اُسے اپنے گھر میں ٹھہرا لینے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''اسے میری مدد کی کیا ضرورت ہے؟ امریکن لڑکیاں یوں ہی ضرورت سے زیادہ بولڈ ہوتی ہیں۔ تنہا دُنیا کے سفر پر نکل پڑتی ہیں...تنہا بڑے بڑے معرکے سر کر لیتی ہیں...تنہا...''

''بس، بھاشن نہ جھاڑ اور فلائٹ کا نمبر نوٹ کر...اور یاد رکھ، لارا کے ڈیڈی میرے باس ہیں۔ان کی ہدایت پر تجھے فون کیا ہے۔''

سعید لارا کو ریسو کرنے گیا اور آدھے گھنٹے کی گفتگو کے بعد اُس کا سارا ٹینشن ختم ہو گیا۔ لارا تو پہلے بھی انڈیا میں تین سال رہ چکی تھی۔ امریکہ میں ہندی کی ڈیمانڈ بڑھ جانے پر دوڑی دوڑی اپنی تعلیم مکمل کرنے آئی تھی۔ یونیورسٹی ہوسٹل میں داخلہ بھی لے لیا تھا اُس نے۔

''ریحان تمھاری اتنی تعریفیں کرتا تھا کہ مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور ڈیڈی کے نام پر میں نے اس سے تمھیں فون کروایا۔ میں غائبانہ طور پر تمھاری پرستار بن گئی ہوں سعید!'' لارا نے صدق دلی سے اعتراف کر لیا۔

چند ہی ہفتوں میں سعید سمجھ گیا کہ واقعی لارا کے ارادے خطرناک ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ تعلیم حاصل کرنے نہیں، سعید کی قربت حاصل کرنے انڈیا آئی ہو۔ سویرے فون کرتی، دوپہر کو فون کرتی۔ اکثر شام کو اس کے آفس پہنچ جاتی۔ سعید پہلے تو مروّتاً اسے برداشت کرتا رہا...

پھر ایک دن برس پڑا۔ ''مجھے فون نہ کیا کرو۔ مجھے تمھارا میرے آفس آنا بھی بالکل پسند نہیں ہے۔''

''کیوں؟ بھلا کیوں؟'' لارا نے شوخی سے پوچھا تھا۔

''میں ایک شریف آدمی ہوں۔''

''غیر ملکی لڑکیوں کو دوست بنانے، اُن کے ساتھ گھومنے میں تو انڈین شان سمجھتے ہیں۔ تم کیسے انڈین ہو؟''

''میں ایسا ہی ہوں۔ مجھے تمھارے ساتھ بات کرتے، گھومتے شرم آتی ہے۔ یہ تمھارا کھلا گریبان، عریاں بانہیں، برہنہ ٹانگیں...''

لارا اُسے درمیان میں ٹوک کر بولی تھی... ''آج کل تو انڈین لڑکیاں بھی ایسا ہی لباس پہنتی ہیں۔''

''مجھ سے بحث نہ کرو۔'' سعید چڑ گیا۔ ''صرف فلموں اور ٹی وی میں یہ فحاشی اور عریانیت نظر آتی ہے۔ عام انڈین لڑکی سرِ بازار یوں عریاں نہیں گھومتی۔''

''مگر میں تو ایسے ہی لباس بچپن سے پہنتی آئی ہوں۔'' لارا کی سمجھ میں نہ آیا کہ سعید اتنا برافروختہ کیوں ہو گیا... اس کی بات پر سعید اور بھڑک اُٹھا... ''تو مجھ سے ملنا کیا ضروری ہے؟ کیوں میرے سر پر سوار رہتی ہو؟''

لارا نے سلیقے کے کپڑے پہننے شروع کیے تھے کہ سعید نے پھر ایک دن ٹوک دیا۔ ''یہ کیا بات بات پر چپک جاتی ہو۔ گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہو... دُور رہ کر بات کیا کرو مجھ سے۔''

لارا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سعید دوسرے نوجوانوں سے الگ کیوں ہے؟ اُس نے تو یونیورسٹی میں لڑکوں کو ہمیشہ اپنے اِردگرد منڈلاتے دیکھا تھا۔ وہ اُس سے خواہ مخواہ قریب ہونے کی کوشش کرتے... چائے کافی، لنچ ڈِنر کے لیے مدعو کرتے رہتے۔ اُن کی دعوتیں قبول کر لینے میں لارا کو عار نہ ہوتا... اُسے اس میں کوئی بُرائی نظر نہ آتی۔

سعید، ملازمت کے سلسلے میں دلّی میں رہ رہا تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرایے پر لے کر رہتا تھا۔ نیک اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ گھومنے اور اسکینڈل بننے سے اتنا ہی ڈرتا تھا جتنا لڑکیاں ڈر سکتی ہیں، مگر لارا زبردستی اس سے دوستی کرنے پر آمادہ تھی۔

ایک روز پوچھ بیٹھی۔ ''سعید! تم کیسی لڑکی سے شادی کرو گے؟''

''میرے لیے لڑکی میری والدہ اور بہنیں پسند کریں گی؟'' اُس نے جواب دیا تھا۔

''تو بھی... کیسی ہوگی وہ لڑکی؟'' لارا نے اصرار کیا تھا۔

''اچھا، پہلے تم بتاؤ، میں کیسا لڑکا ہوں... مگر یاد رہے ہمیشہ جو بک بک کرتی ہو وہ نہ کرنا کہ میں چاکلیٹ ہیرو جیسا ہینڈسم ہوں، مکھن کی طرح ملائم میرے بال ہیں... یونانی دیوتاؤں کی طرح میرا حسن ہے۔ مجھے یہ لغویات پسند نہیں... یہ فلمی ڈائیلاگ، یہ سستی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔''

لارا شرمندہ ہو کر بولی: ''سعید! بے حد کڑوا بولتے ہو... مگر میں کیا کروں؟ جس ملک سے آئی ہوں وہاں یہ باتیں عام ہیں۔''

''تمھارا مذہب کیا کہتا ہے؟ کیا وہ مردوں عورتوں کے اختلاط کی اجازت دیتا ہے؟'' سعید کچھ نرم پڑ کر بولا۔

''مذہب؟'' لارا نے ایک طویل سانس لی۔ ''میرے ڈیڈی عیسائی ہیں اور ممّی یہودی۔ مگر دونوں ہی کسی گاڈ کو نہیں مانتے... کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ نام کے عیسائی، نام کے یہودی ہیں۔''

''تم تو مانتی ہو؟''

''میں کیسے مانوں گی؟ میں کیسے جانوں گی کہ کوئی گاڈ ہے... ڈیڈی ممّی کو کسی گاڈ کے آگے سر جھکاتے دیکھتی، کسی گاڈ سے انھیں کچھ مانگتے دیکھتی... کسی گاڈ سے انھیں ڈرتے دیکھتی تو مانتی کہ کوئی طاقت ہے جو سب کچھ دیکھتی ہے جس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے...''

سعید کو بڑا ترس آیا لارا پر۔ بولا: ''میں اسی لیے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کی شادی کے خلاف ہوں... وہاں مذہب نہیں محبت اہم ہوتی ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ مذہب کے بغیر کوئی کیسے جی سکتا ہے! ہاں! میں نے تم سے اپنے بارے میں رائے پوچھی تھی؟''

''تم اچھے ہو سعید! بہت اچھے!'' لارا جذباتی ہوگئی۔

''اگر میں اچھا ہوں تو مجھے اچھا بنایا ہے میرے ماحول نے، میرے مذہب نے، میرے والدین خصوصاً میری امّی نے۔ میں بھی اپنے بچّوں کو اچھا بنانا چاہوں گا اس لیے ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو اچھی ماں ثابت ہو۔''

چاہ کر بھی لارا سعید سے نہیں پوچھ سکی کہ اچھی لڑکی کا اُس کا معیار کیا ہے؟ اور سعید تو پھر سعید تھا۔ اس کی نظروں کا سوال سمجھ کر بھی نظر انداز کر گیا۔

جیسے جیسے لارا کے واپس لوٹنے کے دِن قریب آرہے تھے، لارا کی اُداسی بڑھتی جاتی تھی۔ سعید جب ملتا تب کہتا: ''یہ سیر سپاٹے، مٹر گشتی بند کرو۔ پڑھائی کرو...'' یا کہتا: ''اپنی فضول سرگرمیوں کو لگام لگاؤ۔ تمھیں کامیاب ہونا ہے۔''

لارا افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک روز بولی تھی: ''ہاں، تم تو چاہتے ہو کہ میرے امتحان ختم ہوں اور میں جلد سے جلد یہاں سے دفع ہو جاؤں۔''

''تم نے میرا دامن نہیں پکڑ رکھا ہے۔ میں نے تمھیں اس کی اجازت ہی نہیں دی... مگر میں چاہتا ہوں کہ تم کامیاب یہاں سے لوٹ کر اپنے وطن جاؤ۔ وہاں روشن مستقبل تمھارا انتظار کر رہا ہے۔'' سعید نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اگر میں واپس نہ جاؤں؟ شادی کر کے یہیں رہ جاؤں تو؟''

''مجھے حیرت نہ ہوگی۔'' سعید کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ لارا کا منہ حیرت سے کھل گیا... پھر اپنے آپ کو سنبھال کر اُس نے کہا تھا... ''تم جاننا نہ چاہو گے کہ وہ کون ہے؟ وہ تم ہو سعید! وہ تم ہو۔''

''جانتا ہوں۔ بہت پہلے سمجھ گیا تھا مگر میرا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے لارا، اُس مٹی نے مجھے ایک مضبوط اور باکردار شخص بنا دیا ہے۔ میں اپنے والدین کا اطاعت گزار، فرمانبردار بیٹا ہوں۔ خاندان کی بہو اور اپنی شریکِ حیات کی کسوٹی پر تمھیں کسنے کی کوشش کر کے میں اس مٹی کی توہین نہیں کروں گا۔''

ذلّت کے احساس سے لارا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... ''سعید! اگر میں اسلام قبول کر لوں؟''

''کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ شادی کرنے کے لیے مذہب تبدیل کرنے والے کئی دیکھے ہیں میں نے۔ مجھے ان کی ذہنیت پر ترس آتا ہے... پھر تمھارے کوئی اخلاق کوئی اقدار نہیں ہیں۔ تم آزادی پسند کرتی ہو۔ خیالات میں آزادی، طرزِ زندگی میں آزادی،... جو میں پسند نہیں کرتا۔ میں زندگی میں چند حدود کا حامی ہوں۔ تم سیکس پر، مرد وزن کے تعلقات پر بات کرنے سے نہیں ہچکچاتیں، مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر تو کیا اُس سے آگے نکل کر کام کرنا چاہتی ہو۔ تم

بے پردگی، بے حیائی، بے وفائی کو پرانے زمانے کی باتیں سمجھتی ہو جبکہ میں انھیں بہت اہمیت دیتا ہوں — تم مذہب تبدیل بھی کرلو لارا تو کیا؟ جڑیں تو تمھاری وہی رہیں گی۔ اُوپر کی شاخیں اور پھول پتّیاں بدلنے سے فطرت نہیں بدل جاتی۔‘‘

لارا بددِل ہو کر جو گئی تو پھر سعید سے نہیں ملی۔ سعید اُس کے ہوٹل گیا، یونیورسٹی گیا مگر اُس سے ملاقات نہ ہوئی۔

تین سال گزر گئے۔ سعید کی شادی ہوئی۔ نیک بیوی اور اللہ تعالیٰ کی تمام تر مہربانیوں کے ساتھ وہ پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ والدین کبھی اُس کے پاس رہتے، کبھی مانک پور اپنے آبائی گاؤں میں رہتے جہاں سعید کے منجھلے بھائی کا خاندان اور اُس کا چھوٹا بھائی زمین داری دیکھتے۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر سب مانک پور میں جمع تھے، جب ایک روز عشاء کی نماز کے بعد مؤذّن صاحب اسے اپنے گھر لے گئے۔ وہ اُس کے والد کے بچپن کے دوست تھے۔ اُسے بیٹھک میں بٹھا کر وہ بولے تھے: ’’سعید میاں! اپنی بیٹی طاہرہ کے تعلق سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

مؤذّن صاحب کی دونوں بیٹیاں عفیفہ اور مریم سعید کی ہم عمر تھیں۔ وہ اب اپنی اپنی سسرال میں تھیں اس لیے حیرت سے اُس نے پوچھا: ’’یہ آپ کی کون سی بیٹی ہے چچا میاں؟‘‘

’’خدا کا عطیہ ہے بیٹا۔ ایک امریکن لڑکی! دلّی میں میرے خالہ زاد بھائی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اُس نے اور پھر میرے پاس آ گئی۔ اُردو عربی سیکھ کر نماز روزہ کی پابند ہو گئی ہے... اب کوئی اُس کے عادات واطوار، اس کے لہجے، اس کے سلوک کو دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی عیسائی تھی۔ میری بیگم تو اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتیں اور میں بھی اُسے عفیفہ اور مریم سے کم نہیں چاہتا۔‘‘

سعید کے ذہن میں وہ معصوم درخواست تازہ ہو اُٹھی جس پر غور کرنے کی اُس نے ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔

مؤذّن صاحب بولے: ’’میری نظر سے اس کی تعلیم مکمل ہو چکی۔ میں اب اُس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق میں نے اُس سے اُس کی مرضی دریافت کی تو اُس نے تمھارے خاندان میں کوئی لڑکا دیکھنے کے لیے کہا... واقعی سعید میاں! آج ہمارے گاؤں میں تمھارے خاندان سے زیادہ نیک اور ذی عزّت خاندان کوئی

نہیں...دیکھو طاہرہ اپنی امّی کے ساتھ تمھارے لیے چائے لے کر آئی ہے۔"

سعید کو یقین ہو چکا تھا پھر بھی اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھ لیا۔ لارا ہی تھی بالکل بدلے ہوئے رُوپ میں۔

اُس نے کہا: "چچا میاں! میں اپنے چھوٹے بھائی حامد کے لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگتا ہوں۔ منظور ہے آپ کو؟"

مؤذّن صاحب نے قبول کر لیا۔ سعید اُٹھ کر کھڑا ہو گیا... "کل بعد مغرب میرے گھر کی خواتین ضروری رسم ادا کرنے آئیں گی اور ہاں بہن طاہرہ...!" اُس نے مخاطب کیا تو طاہرہ کی نظریں بے اختیار اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ سعید نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "میں فیشن پرست لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا۔ ہمارے خاندان میں ایک بدلی ہوئی لڑکی کے رول میں شامل ہونے پر نہ صرف میں آپ کا استقبال کرتا ہوں بلکہ آپ کو سلام کرتا ہوں۔"

○○

اپنی مٹّی کی تلاش میں

اپنے ملک کی اہمیت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم غیر ملک میں جاتے ہیں۔ ابتدا میں بھلے ہی غیر ملک کا عیش و آرام اور چکا چوندھ ہمیں متاثر کر لے، رفتہ رفتہ وطن کی مٹی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے... جیسے پرندے تمام دن کہیں بھی گھومیں، پھریں، رات کو اپنے بسیرے پر لوٹ آتے ہیں۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے شادی کے بعد انھیں بھی اپنے ساتھ لندن لے آئی۔ انھیں لندن کا موسم راس نہ آیا۔ دو برسوں ہی میں دونوں داغِ مفارقت دے گئے۔ میں ہندستان لوٹنے کو ترس گئی۔ حالانکہ وہاں پھوپھی جان تھیں، میرے شوہر کے رشتہ دار تھے... مگر میکہ تو ماں سے ہوتا ہے۔ امّی نہیں رہیں تو میں نے وطن جانا ہی چھوڑ دیا۔

میرا بیٹا شاہ رُخ شادی کی عمر کو پہنچا تو میری ساس نے بہت زور دے کر کہا: ''لڑکی ہندستانی ہونی چاہیے۔'' میں بھی یہی چاہتی تھی مگر میرے شوہر نے شاہ رُخ کا ساتھ دیا۔ وہ روزی کو پسند کرتا تھا۔ اُس سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ میری ساس کو اور مجھے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ دینا پڑا۔ شاہ رُخ اور روزی کی شادی ہوئی۔ وہ علیحدہ فلیٹ میں رہنے چلے گئے۔

ویسے مجھے روزی عرف رضیہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی بہو ثابت ہو رہی تھی۔ اُس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دینی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی مگر اس طرح کی شادیوں میں بچّوں کو جو تربیت ملنی چاہیے وہ نہیں ملتی۔ بچپن کا زمانہ بچّوں کی تعلیم و تربیت کا بہترین زمانہ ہوتا ہے جب وہ والدین کے طرزِ زندگی سے زندگی کے سبق سیکھتے ہیں۔ آج والدین کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ بچّوں کی طرف پوری توجہ دے سکیں... ہاں جب انھیں

وقت ملتا ہے بچوّں کو نزدیک بٹھا کر وہ ڈھیر ساری باتیں انھیں سکھا دینا چاہتے ہیں...یعنی آج بچوّں کی تربیت کا فقدان ہے...بس تعلیم ہی تعلیم ہے جو زبردستی اُن کے اذہان میں بھرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔شاہ رُخ اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا مگر زبان سے اقرار نہیں کرتا تھا۔وہ ہر اتوار کو یا تو ہمیں اپنے گھر مدعو کر لیتا یا بچوّں کے ساتھ ہمارے گھر آ جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ دادا دادی کے ساتھ رہ کر اُس کے بچےّ اسلامی تہذیب سیکھیں اور اسلامیات کی تعلیم حاصل کریں۔

رضیہ یا روزی کی بس ایک بات مجھے زہر لگتی تھی۔ وہ ہندوستان کے نام سے بدکتی تھی۔ ’پُور اِنڈیا‘ اور’ پُور اِنڈین پیپل‘ الفاظ سے وہ میرے وطن اور میرے ہم وطنوں کو پکارتی تو میری جان جل جاتی۔

اکثر وہ کہتی: ’’شاہ رُخ ڈارلنگ! میں تمھارے ساتھ بلا عُذر جہنّم میں رہ لوں گی مگر مجھے انڈیا نہ لے جانا۔وہاں جانے کے تصوّر سے میں کانپ جاتی ہوں۔‘‘

مجھے روزی کا ایسا کہنا بھی اتنا نہیں اکھرتا تھا جتنا شاہ رُخ کا خاموشی اختیار کرنا یا احتجاج نہ کرنا تکلیف پہنچاتا تھا۔روزی اپنے ملک کے مقابلے دوسرے ملک کو حقیر سمجھتی تھی۔اُسے اپنے وطن پر فخر تھا تو شاہ رُخ کو اپنے وطن سے لگاؤ کیوں نہیں ہے یہ سمجھنے سے میں قاصر تھی۔

’’کیوں؟ انڈیا جانے کے تصوّر سے کیوں کانپ جاتی ہو؟‘‘ ایک روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں پوچھ بیٹھی تھی۔’’ممّا! انڈیا کتنا پُور ہے۔وہاں کے لوگ غیر مہذّب ہیں۔عورتوں کو مرد کے پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔پُور انڈین پیپل یہ نہیں سمجھتے کہ زمانہ کتنا ترقی کر گیا ہے...‘‘

’’ایسا سوچنا غلط ہے رضیہ! تم اپنے دِل سے یہ باتیں نکال دو۔میں ایک مرتبہ تمھیں ضرور ہی ہندستان لے جاؤں گی اور تب تمھیں افسوس ہوگا کہ تم اپنے شوہر کے ملک کے بارے میں کتنا غلط سوچتی ہو۔‘‘

’’وہ شاہ رُخ کا ملک کہاں ہے ممّا! میری طرح شاہ رُخ نے ہندوستان دیکھا کب ہے؟ اس کی پیدائش، اُس کی تعلیم تو سب لندن ہی میں ہوئی ہے۔‘‘روزی نے ہنس کر کہا۔ میں دل ہی دِل میں پشیمان ہوگئی جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہو۔میں کہنا چاہتی تھی کہ میرے توسط سے، اپنے والدین کے ذریعے اُس کا تعلق ہندوستان سے ہمیشہ بنا رہے گا۔ وہ ہندوستان کا ہے، ہندوستان ہی کا رہے گا۔وہ لوٹ کر ایک نہ ایک دن ہندوستان جائے گا اور تم اُس کی محبت سے

بندھی ہوئی اُس کے ساتھ جاؤ گی... مگر کہہ نہ سکی کہ وقت موزوں نہیں تھا۔ زبانی سمجھانے کی بجائے اُسے ہندوستان لے جا کر سمجھانا چاہتی تھی۔

بیٹی سائرہ کی شادی ہم نے لندن میں بسے خاندان کے ایک نوجوان سے کی۔ وہ لوگ پوری طرح غیر ملکی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے۔ میرا بس چلتا تو میں بیٹی ان کے یہاں ہرگز نہ دیتی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ سائرہ کو بھی والد کی حمایت حاصل تھی۔ یوں میرے شوہر غیر ملکی تہذیب کے دلدادہ نہیں تھے۔ وہ بھی ہندستانی اقدار سے پیار کرتے تھے مگر وہ بچّوں کی خواہش کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ سائرہ کے لیے رشتہ آیا تو اُنھوں نے سائرہ کی مرضی جاننا چاہی اور سائرہ سے گرین سگنل ملتے ہی رشتہ طے کر دیا۔ اب سائرہ خوش تھی تو ہم بھی مطمئن تھے۔

اس دوران میری ساس کا انتقال ہو گیا۔ مرتے مرتے بھی اُنھوں نے مجھے کم سے کم ایک بہو تو ہندوستان سے لانے کی التجا کی تھی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اُن کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔

ایک روز جب ہم سب کھانے کی میز پر جمع تھے میں نے اپنے چھوٹے بیٹے شاہ زیب سے کہا: ''بیٹے، تمھاری دادی جان کی خواہش تھی اور میری بھی خواہش ہے کہ تم کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی کرو۔''

میرے شوہر نے ہنس کر کہا ''تم نے غلط جگہ سے بات شروع کی ہے... پہلے اس سے پوچھو کہ اِس نے کوئی لڑکی تو نہیں پسند کر لی؟''

میں نے بڑی اُمیدوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اُس نے کہا: ''میں ابھی کم از کم دو برس شادی کے جھمیلے سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔''

''شادی نہ کرو ابھی۔ مگر لڑکی دیکھ رکھنے میں کیا مضائقہ ہے؟'' میں نے کہا۔

''ممّا!'' شاہ زیب مجھے بچّوں کی طرح بہلاتا ہوا بولا۔ ''اگر آپ شادی کے لیے جلدی نہ کریں تو ہوسکتا ہے میں آپ کی خواہش پوری کرنے کی بابت سوچوں۔ فی الحال تو میں اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہوں...'' وہ کچھ لمحوں کے لیے رُکا پھر بولا: ''ممّا! آپ ہندوستان سے بہو لانے پر کیوں بضد ہیں؟ یہاں آنے کے بعد وہ یہاں کے رنگ میں رنگ جائے گی تب آپ کیا کر لیں گی؟''

''تم شاید اسے نہ سمجھو۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''مگر یہ حقیقت ہے کہ جڑیں

زمین کے اندر گہری ہوں تو مٹی سے تعلق بھی گہرا ہوتا ہے۔"

اتفاقاً اس واقعہ کے چند روز بعد ہی شاہ زیب کو کمپنی کے کام سے ہندوستان جانا پڑا۔ میں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرتاپ گڑھ، مانک پور، جون پور، الہ آباد کے تمام رشتہ داروں کے پتے اس تاکید کے ساتھ شاہ زیب کے سپرد کیے کہ وہ سب سے ملے گا اور اگر کوئی لڑکی اُسے پسند آ جائے گی تو فوراً ہمیں مطلع کرے گا۔ ہم ہندوستان پہنچ کر اُسے مانگ لیں گے۔

"مگر میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا ممّا" شاہ زیب نے احتجاج کیا۔

"بیٹے جان! ہندوستان جانے کا پروگرام میں نے نہیں بنایا۔ قدرت نے یہ موقع فراہم کیا ہے۔ ہوسکتا ہے تم اسی بہانے اپنی ماں کی خواہش پوری کر کے اُس پر احسان کر دو" میں نے اپنی نم آنکھوں پر بے اختیار ہاتھ رکھ لیا۔

"اوہ ممّا!" شاہ زیب جذباتی ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ سب رشتہ داروں سے ملوں گا لیکن لڑکی پسند کرنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ ہاں البتہ یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ جب بھی شادی کرنے کا موڈ بناؤں گا آپ کی خواہش کو ضرور سامنے رکھوں گا۔"

اِسی شاہ زیب نے ہندوستان پہنچنے کے تیرہ دِن بعد ہی ہمیں فون کیا۔ "پرتاپ گڑھ پہنچ جائیے۔ میں نے آپ کے لیے بہو پسند کر لی ہے۔"

ہم دوسرے ہی روز ہندوستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے بے چینی سے پوچھا: "شاہ زیب جان! کون ہے وہ لڑکی جو ہماری بہو بنے گی؟"

"زینب... آپ کی پھوپھی جان کی پوتی۔"

"فرزانہ پھوپھی کی پوتی..." سکون کی ایک لہر میری رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

"آخر اپنی ممّا کے رشتہ داروں ہی میں لڑکی پسند کی... کیوں بھئی؟ ہمارے رشتہ دار تمھیں کیسے لگے..." میرے شوہر نے مذاقاً کہا تو شاہ زیب جلدی سے بولا: "ڈیڈی! ایسی بات نہیں ہے... یہاں کے سب لوگ بہت اچھے ہیں... بہت پیار کرنے والے... مگر لڑکی تو ایک ہی پسند کرنی تھی نا..."

"بیٹے!" میں نے کہا۔ "کیا تم سب سے پہلے فرزانہ پھوپھی ہی کے گھر گئے تھے؟"

"نہیں۔ پرتاپ گڑھ میں آپ نے شبّیر نانا کا پتہ سب سے اُوپر لکھا تھا۔ اُن کے گھر پہنچا تو دروازہ میں آدھے کلو کا قفل لگا تھا۔ گھر کے تمام افراد شادی میں کہیں گئے ہوئے تھے... میں

نے فرزانہ نانی کے گھر کا رُخ کیا...وہاں پہنچا اور...''

''...بس وہیں کا ہو کر رہ گیا...'' میرے شوہر نے جملہ پورا کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

شاہ زیب نے شرما کر سر جھکا لیا۔ میں نے دھڑکتے دِل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا: ''پھوپھی جان نے میرے بارے میں کیا پوچھا؟''

''ارے! سب کچھ آپ ہی کے بارے میں پوچھا...آپ ہی کی باتیں کرتی رہیں...کہتی تھیں کہ پردیس جا کر آپ نے انھیں بھلا دیا۔''

''ایسی بات نہیں ہے بیٹے۔ مگر یہ تو بتاؤ زینب کی کس بات نے تمھیں سب سے زیادہ متاثر کیا؟''

''اُس کی سادگی نے ممّا...اُس کی سادگی نے...وہ بہت اچھی ہے...'' شاہ زیب نے کہا ''میں رشتہ داروں میں جہاں جہاں گیا سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑے بوڑھوں کے علاوہ خود لڑکیوں نے بھی میری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر یہاں معاملہ اُلٹا رہا۔ فرزانہ نانی نے زینب کی خوبیوں کا ذکر کیا نہ اُس کی تعریفوں کے پُل باندھے...زینب نے بھی سج دھج کر میرے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی...اُن لوگوں کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ آپ لوگ یہاں پہنچ رہے ہیں۔''

میں ماضی میں پہنچ گئی تھی جہاں میں اور پھوپھی کے بیٹے، زینب کے والد حسن صبح سے شام تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے...ہم ساتھ ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے...میری خاموشی سے مشکوک ہو کر شاہ زیب نے کہا: ''ممّا، آپ زینب کو ضرور پسند کریں گی۔''

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر کہا: ''میری خاموشی کا غلط مطلب اخذ نہ کرو۔ میں سفر سے تھک گئی ہوں۔ تمھاری پسند ہماری پسند ہے۔''

میں نے کار کی پشت پر سر ٹیک دیا اور تیس سال پیچھے پہنچ گئی۔

فرزانہ پھوپھی میرے ابا کے سامنے دامن پھیلائے کھڑی تھیں۔ ''بھائی جان! میری بات رکھ لیجیے۔ ہمیں معلوم تو ہو کہ آخر کس بات سے ناراض ہو کر آپ نے رشتہ توڑا ہے۔''

''میں تمھاری کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا۔''

''بھائی جان! منگنی ٹوٹ جانے سے جو بدنامی ہوگی اُسے حسن کے ابا برداشت نہیں

کر پائیں گے۔ للٰلہ ہمارا قصور تو بتایئے۔“

ابا جواب دیتے تو کیا دیتے۔ لندن میں بسے خوشحال خاندان کے اکلوتے بیٹے کا رشتہ آنے پر ابا نے بچپن کی منگنی توڑ دی۔ چھوٹی بہن کی خوشیوں کا بھی خیال نہ کیا۔ تیس برس پہلے غیر ملک میں لڑکی بیاہنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔

پھوپھا جان کتنے ہی روز منہ لپیٹے پڑے رہے۔ ایک رات ایسے سوئے کہ اُٹھے ہی نہیں۔ ابا کا پتھر دل پھر بھی نرم نہ ہوا۔ مقرّرہ وقت پر میری شادی کر دی۔ میں لندن کی ہوگئی۔ شاہ رُخ، شاہ زیب اور سائرہ کی ولادت تک حسن نے شادی نہیں کی تھی۔ جب پھوپھی بیمار رہنے لگیں تو زینب کی امّی کو بیاہ کر لے آئے۔

”ممّا!“ شاہ زیب نے پکارا تو میں خیالوں کے بھنور سے باہر نکل آئی۔ شاہ زیب ہمیں لے کر اندر پہنچا... ”نانی جان، یہ میری ممّا ہیں... یہ میرے ڈیڈی۔“

پھوپھی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور زار و قطار رونے لگیں۔

زینب خوبصورت گڑیا سی لڑکی تھی۔ ہم دونوں کو پسند آئی۔ ہم نے شاہ زیب کے انتخاب کی داد دی۔

رات کو کھانے کے بعد میں پھوپھی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ان کا جھرّیوں بھرا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور کہا: ”پیاری پھوپھی! میں ایک مرتبہ پھر آپ کا سکون چھیننے آئی ہوں۔“

”کیا؟ کیا کہہ رہی ہے لڑکی۔“ پھوپھی نے کانپ کر اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا مگر میں نے اور سختی سے اُسے جکڑ لیا۔ ”میں کرتی کیا پھوپھی؟ ابا کسی کی سنتے تھے بھلا؟“

انھوں نے بے انتہا صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ”جو ہوا اُسے یاد نہ کر! میں اگر بیمار نہ پڑ جاتی تو حسن شادی کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا۔ خدا بخشے زینب کی ماں کو... مجھے بہت سکھ دیا اُس نے... مگر تقدیر اُسے ہم سے جدا کر گئی۔ کہاں میں بیمار ہو کر بستر سے لگ گئی تھی کہاں مجھے ہی زینب کی پرورش کرنی پڑی۔ حسن بھی چلا گیا... اب ہم دونوں دادی پوتی ہیں۔ کھیتوں کی آمدنی پر گزارہ ہو رہا ہے۔“

”پھوپھی! میں نے ابھی کہا تھا نا کہ میں پھر آپ کا سکون چھیننے آئی ہوں... میں زینب کو بہو بنا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ میں نے ایک ہی سانس میں اپنی بات کہہ دی۔ پھوپھی

فرطِ حیرت سے مجھے دیکھتی رہ گئیں۔

''میں جانتی ہوں۔ زینب میں آپ کی جان ہے۔ آپ اُس کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ مگر میں اسے لے جاؤں گی ضرور۔ وہ میرے بیٹے کی پسند ہے۔ آپ اُس کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ہم آپ کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔''

''ٹھہر ٹھہر لڑکی!'' پھوپھی نے دِل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک ساتھ اتنی خوشیاں نہ دے، میرا دِل حرکت کرنا موقوف کر دے گا... زینب کو شاہ زیب نے پسند کر لیا ہے، بڑی خوشی کی بات ہے... مجھے بھی شاہ زیب پسند ہے... بڑا ہی ہونہار لڑکا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زینب میری جان ہے مگر اُس کی شادی اچھے لڑکے سے ہو... وہ اپنے گھر کی ہو جائے اس کے لیے میں اُس سے جدائی گوارا کر لوں گی۔''

''نہیں... جدا کیوں ہوں گی آپ؟'' میں نے کہا تو پھوپھی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا... ''نہیں، زینب سسرال جائے گی۔ تم مجھے میری نند کے پاس الٰہ آباد پہنچا دو۔ وہ میری نند بھی ہے سہیلی بھی۔ میں زندگی کے بقیہ دن وہاں گزاروں گی۔''

پھر سب کچھ بڑی عجلت میں ہوا۔ رشتہ داروں کے درمیان ایک سادہ سی تقریب میں شاہ زیب اور زینب کی شادی ہو گئی... شاہ رُخ اور رضیہ بچّوں کے ساتھ تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ رضیہ میری انگریز بہو، ہندوستانی لباس میں ہندوستانی زبان میں ہندوستانیوں سے باتیں کر رہی تھی... وہ اُس پر محبّتوں کی بارش کر رہے تھے اور وہ مجھ سے بار بار پوچھتی تھی... ''ممّا، میں ان محبّتوں کا جواب کیسے دے پاؤں گی؟''

میں بھلا کیا جواب دیتی؟ کچھ دِنوں میں وہ خود ہی جان لینے والی تھی کہ اِنڈین پیپل کچھ لینے کی غرض سے محبّت نہیں کرتے۔ یہ تو ان کی خاصیت ہے، اُن کی پہچان ہے۔

OO

تیاگ

عوام کے محبوب رہنما کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے، انسانیت کے دُشمنوں نے بہت سوچ سمجھ کر دن کا، جگہ کا اور موقع کا انتخاب کیا تھا۔

یوں تو ہر جمعرات کو بابا کے مزار پر عقیدت مندوں کا ہجوم، میلہ سا برپا کر دیتا تھا مگر نو چندی جمعرات کی بات ہی الگ تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس روز ایک مخصوص ساعت میں مانگی گئی ہر دُعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہے۔

وہ ایک سرو قد، نازک اندام، تیکھے نین نقوش والی جوان العمر عورت تھی۔ کمر تک جھولتی چوٹی، بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور سرخ ڈوروں کی حد بندی کرتی کاجل کی لکیریں۔ گہرے شوخ رنگ کی لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں کے پیچھے انار کے دانوں جیسے جگمگاتے دانت۔ سرخ رنگ کے پھولوں والا سوٹ پہنے وہ اپنے شوہر کے بازوؤں کا سہارا لیتی ہوئی سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھا رہی تھی۔

اُس کا مرد ایک عام سا نوجوان تھا۔ اُس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اُسے دوسرے نوجوانوں سے ممتاز کرتی۔ عورتوں میں بھی ایک سے ایک حسین چہرے نظر آ رہے تھے، مگر وہ دونوں بھیڑ میں ہوتے ہوئے بھی بھیڑ کا حصّہ نہیں تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عورت پورے دِنوں سے تھی۔

چاروں طرف انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا... وہ دونوں آہستہ آہستہ مگر ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہرِوندر کور نے انھیں دیکھا تو اُسے اپنے دن یاد آ گئے۔

سترہ سال کی تھی وہ جب اُس کی شادی ہوئی تھی... گود بھری پورے اکیس سال بعد۔ کیا

کیا نہ جتن اُس نے کیے۔ کوئی عبادت گاہ نہ چھوڑی، گنڈے تعویذ، دُعا ٹوٹکا، ڈاکٹری حکیمی سب کرلی... مگر من کی مراد حاصل ہوئی معصوم شاہ بابا کے مزار پر آ کر۔ ننگے پاؤں چل کر آئی تھی۔ منّت مانگنے کے بعد لوگوں کو اُٹھا کر لے جانا پڑا۔ پاؤں میں چھالے پڑ کر پھوٹ گئے تھے۔

ہر وِندر کا پتی اُس سے گیارہ برس بڑا تھا۔ بیمار بھی رہتا تھا۔ ہر وندر کی ساس کہتی تھی: "بے اولادی کا غم اُسے گھُن کی طرح چاٹ گیا ہے۔" کلدیپ کا جنم ہوا تو دُنیا بدل گئی دونوں پتی پتنی کی۔ ہر وندر کو تو جیسے دُنیا جہان کا خزانہ مل گیا... اُس کے پتی کے چہرے پر بہاروں نے رنگ بکھیر دیئے... ایسے ناز ونعم سے کلدیپ کی پرورش ہوئی کہ لوگ دیکھتے اور دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے۔

نوجوان اپنی بیوی کو لے کر مزار کے پچھلے حصّے میں پہنچ گیا تھا۔ سامنے کی طرف پولیس تعینات تھی۔ آج ایک بڑی ہستی بھی بابا کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھانے آ رہی تھی۔ عورت اپنا مٹکا سا پیٹ سنبھالے ہانپتی ہوئی ایک طرف ٹِک گئی۔ وہ پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ شوہر اُسے بٹھا کر شاید پانی لینے چلا گیا۔

ہر وِندر نے منّت مانگتے وقت بیٹے اور صرف بیٹے کی مانگ کی تھی۔ خواہش پوری ہوئی مگر جیسے جیسے کلدیپ بڑا ہوتا گیا عام پنجابی نوجوانوں کی طرح اس کا قد تو لمبا ہو گیا مگر بدن نہ بن سکا۔ کیس عورتوں کے بالوں کی طرح تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ مزاج میں نزاکت دوشیزاؤں جیسی تھی تو ناز نخرے کسی شہزادی سے کم نہیں تھے۔ انتہائے محبّت میں ہر وِندر اُسے ذرا دیر کو بھی خود سے جدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ گھر گھُسا کہنے لگے اُسے سب... پتی کی وفات کے بعد تو کلدیپ کو ہتھیلی کا پھپولا بنا لیا ہر وِندر نے۔

عورت اپنے وجود کی تکمیل ماں بننے میں مانتی ہے۔ صحیح بھی ہے۔ مگر جب اولاد اُس کے وجود کو لمحہ لمحہ صلیب پر چڑھاتی ہے تب اُس کا دِل خون کے آنسو روتا ہے۔ وقت نے اچانک ایسی کروٹ لی کہ اندھیرے سے خوف کھانے والا، ذرا زور کی آواز پر چونک اُٹھنے والا، چیونٹی کو بھی تکلیف نہ پہنچانے والا کلدیپ مَوت کا اندھیرا پھیلانے، ٹامی گنوں کے شور سے معصوموں، بے گناہوں کو دہلانے اور زندگی سے بھرپور انسانوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح مسلنے میں مشغول ہو گیا۔ وہ انگلیاں جو ماں کے جھرّیوں بھرے چہرے کو سہلا کر اُس کے بڑھاپے کا سہارا بننے کا عزم ظاہر کیا کرتی تھیں، رائفل، ٹامی گن اور دوسرے ہتھیاروں سے کھیلنے میں لطف حاصل کرنے لگیں۔

علاقے میں دہشت گردی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی تھی۔ تخریب کاروں کو اپنے ناپاک عزائم کے سامنے بھلا بُرا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ عوام میں افراتفری پھیلا کر وہ اپنی حیوانی جبلتوں کی تسکین کرتے تھے۔ کچّی عمر کے نوجوان بآسانی اُن کے بہکاوے میں آجاتے تھے۔

عورت آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی مزار کے بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ بار باراُس کے ہاتھ بظاہر پسینہ خشک کرنے کے لیے چہرے تک جاتے تھے۔ درحقیقت وہ اس بہانے ہاتھوں کا چھجّہ بنا کر چاروں طرف نظریں دوڑاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا کرتے ہوئے اُس کی نظریں ہرونِدر پر جا کر اٹک گئیں۔

کلدیپ کے باہر وقت گزارنے کا وقفہ طویل ہونے لگا۔ ہرونِدر کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔

اُس دن ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کلدیپ پسینے میں شرابور گھر میں داخل ہوا۔

موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور بال کھول کر غسل خانے میں شاور کے نیچے جا کھڑا ہوا تھا۔ ہرونِدر کے تڑپ کر پوچھنے پر کہ وہ کہاں سے آرہا ہے؟... پہلی بار بے ساختگی میں کہہ گیا تھا کہ 'بڑے چوک سے'۔ مگر پھر لبوں کو سی لیا تھا۔ ہرونِدر پوچھتی رہ گئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

آدھا گھنٹہ بعد خبر ملی تھی کہ بڑے چوک پر موٹر سائیکل پر سوار دہشت پسندوں نے کئی لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا تھا۔ چوک پر خون کی ندی بہنے لگی تھی... ہرونِدر نے اپنے آپ یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس کا نازک مزاج بیٹا اُس خونی منظر کی تاب نہیں لا سکا تھا اس لیے دماغ ٹھنڈا کر رہا تھا... مگر کب تک؟ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہرونِدر کی آنکھیں کھلتی گئیں۔

عورت شدید حیرت کے عالم میں ہرونِدر کی طرف کھسکتی چلی گئی۔ ہرونِدر ضعیفی اور کمزوری کے سبب تھک کر بے حال ہو چکی تھی۔ پنڈلیاں سوج گئی تھیں۔ پاؤں کے چھالے کھڑا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ہار کر اُس نے وہیں سر ٹیک دیا پھر بے قابو ہو کر چلّائی: ''بابا... جو اولاد تم نے دی تھی اُسے واپس لے لو... واپس لے لو۔ میری گود میں آکر اُس نے نہ جانے کتنی ماؤں کی کوکھ اُجاڑ دی ہے... اُسے جلا کر خاک کر دو مولا... جلا کر خاک کر دو...''

دہشت گردی کے آج کے ماحول میں ہر ماں کا فرض بنتا ہے کہ ہر بار اپنے بیٹے کی پیشانی پر ممتا کی مہر ثبت کرتے ہوئے یہ سونگھنے کی کوشش کرے کہ اُس کے پسینے میں بے گناہوں کے

خون کی بُو تو شامل نہیں ہے؟ اُس کے قدموں کو عقیدت سے چھونے والی انگلیاں ٹریگر پر چل کر کسی کو بیوہ، کسی کو یتیم بنا کر یا کسی کے بڑھاپے کا سہارا چھین کر تو نہیں آئی ہیں؟ اُس کی بھوک اُڑ جانے یا دماغ پر گرمی چڑھ جانے کا سبب کسی تخریبی کارروائی میں ناکام رہ جانا تو نہیں ہے۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اس ہندوستان میں مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں اپنے عزیزوں کو ہنستے چہروں سے میدانِ جنگ میں روانہ کرتی آئی ہیں تاکہ وہ ملک کی حفاظت کرسکیں۔

آج وہ عورتیں کیوں اپنی روایتی بہادری کا مظاہرہ نہیں کرتی ہیں؟ اپنے عزیزوں کے دہشت پسندی کے رجحان سے واقف ہوتے ہی کیوں اُن پر ممتا کے دروازے بند نہیں کر دیتیں؟ کیوں انھیں دتکارنے کا حوصلہ نہیں دِکھاتیں؟

عورت سر سے پیر تک لرز رہی تھی۔ اُس کی نظریں اپنی کلائی پر مرکوز تھیں۔ اُسی وقت سیاسی رہنما کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا... وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اور دیوانہ وار ایک طرف بھاگنے لگی۔ ایسی مخدوش حالت میں اُس عورت کو لمبے لمبے ڈگ بھر کر بھاگتے ہوئے دیکھ لوگ حیرت سے اپنی جگہ جم گئے... پھر ڈیوٹی پر تعینات سپاہیوں کو ہوش آیا۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑے مگر تب تک اُس نے کنارے پہنچ کر تالاب میں چھلانگ لگا دی تھی۔

ایک زوردار دھماکے سے فضا گونج اُٹھی۔ شوروغل، چیخ پکار مچ گئی، اور پھر اُس انسانی بم کی شناخت ہوگئی۔ پیٹ پر بندھا بارُود چھپانے کے لیے حاملہ عورت کا سوانگ بھر کر وہ سیاسی رہنما کو ختم کرنے آیا تھا۔

ہرِوِندر نے بیٹے کی موت پر ایک قطرہ آنسو نہیں بہایا۔

ممتا سے مجبور ہو کر اگر وہ بابا سے اپنے بیٹے کے راہِ راست پر آجانے یا اُس کی درازیٔ عمر کی دُعا مانگتی تو کلدیپ یقیناً ہی اپنے شیطانی منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیتا۔ وہ لاکھ ناتجربہ کار سہی، اتنا تو سمجھتا تھا کہ اولاد کو دُنیا بھر کے مصائب اور بلاؤں سے اپنے آنچل میں چھپا کر محفوظ رکھنے والی ماں ممتا کو کب تیاگ دیتی ہے؟ کلدیپ کو اگر موقع ملتا تو وہ زمانے سے چیخ چیخ کر کہتا کہ ''لوگو! جان لو کہ جب کوئی ماں اپنی ہی کوکھ سے جنمی اولاد کے لیے مَوت مانگتی ہے تو وہ یقیناً غلطی پر ہوتا ہے۔''

OO

ننگی ٹانگوں والی عورت

پورے ستائیس گھنٹوں بعد مجھے ہوش آیا تھا۔ داہنا ہاتھ، کندھا اور سر پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ بظاہر میں کمزور اور ذہنی طور پر بیمار نظر آ رہی تھی۔ اس لیے کمرے میں موجود ڈاکٹر، میرے بابا، میری نند، سب مجھے یہ بتانے میں پس و پیش کر رہے تھے کہ حادثے میں احمد اور شبینا ختم ہو گئے، میری زندگی باقی تھی اس لیے میں بچ گئی۔

لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ شدید زخمی ہونے کے باوجود میں غیر معمولی طور پر پُرسکون تھی۔ سب کچھ دیکھ سمجھ رہی تھی۔

احمد میرے شریکِ حیات اور شبینا ہماری واحد اولاد تھی۔ اُن کی یاد آتے ہی ایک کسک سی دل میں اُٹھتی تھی جو بے اختیار مجھے وقت کے دھارے کی مخالف سمت لے گئی۔

بائیس برس قبل ہماری شادی ہوئی تھی۔ احمد نہایت روشن خیال شخص تھے۔ وہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جو منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، پھر بھی جن کے قدم زمین پر ہوتے ہیں، وہ اکثر کہا کرتے ''روز افزوں ترقی کرتا بزنس، حسین شریکِ حیات اور اور شبینا جیسی باصلاحیت اولاد مجھے زندگی بھر خدا کا ممنون رکھنے کے لیے کافی ہیں۔''

مجھے انھوں نے نہایت ڈرامائی انداز میں پسند کیا تھا۔ میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بابا اسکول میں پڑھاتے تھے۔ دو سال قبل امّی کا انتقال ہو چکا تھا۔ شہر سے باہر نئی کالونی میں بابا نے بھی ایک چھوٹا سا مکان بنایا تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر کو احمد نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بابا نے دروازہ کھولا تو بغیر کسی تمہید کے بولے: ''وہ سامنے میری گاڑی خراب ہو گئی

ہے۔ڈرائیور دوسری گاڑی لانے گیا ہے۔ میں دھوپ سے پریشان ہوگیا۔آپ کا مکان قریب تھا۔دستک دے دی۔‘‘

بابا نے انھیں اندر بٹھایا۔ میں نے ٹھنڈا شربت پیش کیا۔وہ زیادہ تر بابا سے باتیں کرتے رہے۔ڈرائیور گاڑی لے کر آیا تو شکریہ ادا کر کے چل دیئے۔دوسرے روز شام کو اپنی بہن اور بہنوئی کو لے کر آئے اور میرا رشتہ مانگ لیا۔

ہم مالی حیثیت میں بھلے ہی ان سے کم ہوں مگر خاندانی تھے۔سماج میں بابا کو عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔بابا نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ہماری شادی ہوگئی۔

احمد اچھے شوہر اور اچھے داماد ثابت ہوئے۔بابا کی تنہائی کا احساس تھا اس لیے ایک ہمہ وقتی ملازمہ کا بندوبست کر دیا۔دو تین روز میں مجھے لے کر بابا سے مل آتے۔بابا کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

’’تم ہیرا ہو۔بس ذرا تراش خراش کی ضرورت ہے۔سب کی آنکھوں کو خیرہ کر دوگی۔‘‘ انھوں نے کہا۔

’’میں سمجھی نہیں۔‘‘

’’دیکھو، میرا ایک حلقۂ احباب ہے۔ بزنس سرکل ہے، جہاں تمام خواتین ماڈرن ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم ان میں موو (Move) کرنے کے لائق بن جاؤ۔میرے ساتھ چلو تو میرا سر فخر سے اُونچا ہو جائے۔کسی محفل میں شریک ہو تو سب کی نظریں تم پر اٹک جائیں...‘‘

میں احتجاج بھی نہ کر سکی اور احمد نے اپنے دِل کی کرلی۔میرے گھنے سیاہ بالوں کو ترشوا کر کندھوں پر پھیلا دیا۔میک اَپ کے گُر سکھائے۔ انگلش رواں کرنے کے لیے ٹیوٹر لگا دیا۔ ڈرائیونگ سکھا کر پندرہ دن میں گاڑی میرے ہاتھ میں دے دی...پھر ایک شاندار پارٹی دے کر مجھے سب کے سامنے پیش کیا۔ جب متفقہ طور پر میں ان کے حلقۂ احباب کی سب سے حسین سب سے باوقار خاتون قرار دے دی گئی تب انھیں چین آیا۔

واقعی میری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ میں کس بے مثال حسن کی مالک ہوں۔احمد مجھے کبھی نیلم، کبھی زمرّد، کبھی پکھراج کہہ کر پکارتے۔ایک ہیرے کی طرح

میری حفاظت کرتے۔

بس ایک خراب بات تھی احمد میں۔ دِل میں جو بات آ جاتی وہ کر کے رہتے۔ دوسرے کی خواہشات کا خیال نہ کرتے مگر میں نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھر کا ماحول کبھی بگڑنے نہ دیا۔ ہم ایک حسین دُنیا میں جی رہے تھے۔

شادی کے چوتھے سال ہمارے آنگن میں ایک پھول کھلا۔ میں بیٹا چاہتی تھی، احمد کو بیٹی کی چاہ تھی۔ یہ شخص جیسے جیتنے ہی کے لیے پیدا ہوا تھا۔ بیٹی ہی پیدا ہوئی... میں نے بڑے ارمانوں سے نام رکھا شاہینہ۔

دیکھتے دیکھتے آٹھ سال گزر گئے۔ میری فگر نہ خراب ہو جائے اس اندیشے سے احمد نے مجھے دوسری بار ماں نہیں بننے دیا تھا۔ شاہینہ ہی میری تمام تر ممتا کا مرکز تھی... مگر احمد نے یہاں بھی میرے حق پر ڈاکہ ڈال دیا۔ شاہینہ کی تعلیم و تربیت کو لے کر ہم میں اختلافات ہونے لگے۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں ان پر بُری طرح برس پڑی... وہ اسکول ریکارڈ پر شاہینہ کا نام بدلوا کر آئے تھے۔

''اُف فوہ!'' میں بھنّا کر بولی۔ ''شینا بھی کوئی نام ہے۔ کیا معنی ہیں اس کے؟''

''کچھ نہ ہوں۔ شاہینہ دقیانوسی نام ہے۔ شینا کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ شینا احمد کہلائے گی میری بیٹی... زمانے کے ساتھ چلنا سیکھو زمرّد!''

''تیراکی، اسکیٹنگ، رقص و موسیقی کی کلاسز میں بھیج کر آپ اُسے کیا بنانا چاہتے ہیں؟ کیا ماڈرن بننے کے لیے اس کے بچپن پر یہ بوجھ ڈالنا ضروری ہے؟... کیا میں یہ سب نہ جانتے ہوئے بھی ماڈرن نہیں ہوں؟'' میں غصّے میں بولتی جا رہی تھی۔

احمد دھیمے سے ہنسے تھے۔ ''تمھاری ایک حد تھی اور حد ہے زمرّد! تمھیں میں اس سے زیادہ نہیں چمکا سکتا تھا۔ میں جوہری ہوں۔ اپنے ہاتھ میں آئے ہیرے کو زیادہ سے زیادہ بیش قیمت بنانا میرا فن ہے۔ میرے کچھ ارمان ہیں۔ نامکمل خواہشات ہیں، شینا میری خواہشات کی تکمیل کرے گی۔ میں اُسے تراش کر چمکتا سورج بناؤں گا۔''

بلاشبہ شینا ایک حیرت انگیز لڑکی تھی۔ بلا کی خوبصورت۔ ہر مقابلے میں اوّل رہتی۔ ہر

کھیل کی ٹرافی پر جیسے اُسی کا نام ہوتا۔ بحث مباحثے میں کوئی اس کے آگے نہ ٹھہرتا۔ مگر وہ جیت کی عادی ہوتی جارہی تھی باپ کی طرح۔ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

شبینا کالگاؤ باپ کی طرف تھا۔ مجھ سے کبھی کھل کر نہ بولتی۔ میں اُس کے کھلے گریبان اور گھٹنوں سے اونچے اسکرٹ پر ٹوکتی تو باپ سے شکایت جڑ دیتی، اور احمد مجھے ماڈرن زمانے کی ضروریات پر لیکچر پلانے بیٹھ جاتے۔ احمد گھر میں ہوتے تب دونوں باپ بیٹی یا توجم میں مصروف ہوتے یا ٹینس کورٹ میں نظر آتے یا جنرل نالج کی موٹی موٹی کتابوں میں سر گھسائے بیٹھے رہتے۔ احمد کی غیر موجودگی میں وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر اُونچی آواز میں ریکارڈ لگا کر موسیقی کی دُھن پر تھرکتی رہتی۔

شبینا کی سترہویں سالگرہ پر احمد مِس انڈیا مقابلے کا فارم لے کر آئے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے وحشت زدہ ہو کر دریافت کیا تھا۔

''دیکھ تو رہی ہو۔ مقابلے کا فارم ہے۔ میں اپنی بیٹی کو مِس انڈیا اور پھر مِس یونیورس کا تاج پہنے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔''

''پرانی بات ہوئی۔'' احمد نے سر جھٹک کر کہا۔ ''اب بالی وُڈ اس کی منزل ہے۔ مقابلۂ حسن جیت کر وہ فلم انڈسٹری میں قدم رکھے گی۔''

میں نے سر پکڑ لیا۔ شبینا کبھی میرے قابو میں نہیں تھی مگر وہ اتنی بھی بے قابو ہو جائے گی یہ میرے تصوّر میں بھی نہ تھا... اور احمد... اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں؟... وہ کیوں یہ فراموش کر گئے کہ ہم کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، کس تہذیب کے پروردہ ہیں؟ یہ ضرور ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے مگر کیا اتنا زوال پذیر ہو گیا ہے کہ باپ اپنی بیٹی کو داؤ پر لگا دے۔ ایک وقت تھا جب بیٹی کے جوان ہوتے ہی اُسے سرخ کپڑوں میں سجا کر سسرال روانہ کیا جاتا تھا۔ اب بیٹی کے جسم سے کپڑے اُتار کر اُسے ججوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے ننگے بدن کی قیمت لگا کر اس کے سر پر تاج رکھ دیں۔

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا: ''احمد! اتنا اُونچا نہ لے جائیں بیٹی کو کہ پھر سنبھال نہ سکیں۔''

''زمین پر قدم جمانے کے بعد ہی آسمان کی طرف قدم بڑھائے ہیں ہم نے۔تم شینا کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو۔خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہی ہو۔''

''آپ کیسے باپ ہیں...''

''شٹ اَپ!'' احمد نے مجھے ڈانٹ دیا۔''آئندہ اس معاملے میں زبان نہ کھولنا۔''

شینا نے مقابلۂ حسن میں شرکت کی اور دوسرے راؤنڈ میں مقابلے سے باہر ہوگئی... پھر بھی ''خوبصورت لمبی ٹانگوں'' کا خطاب حاصل کرگئی جس نے اس کے لیے ماڈلنگ کی راہ کھول دی۔ وہ ممبئی سے لوٹ کر نہیں آئی۔ اُس کا Proud Father اُس کی بے شمار تصاویر لے کر لوٹا۔ میرے سامنے ٹیبل پر ان تصاویر کو پھیلا کر احمد نے فخر سے کہا:''دیکھو، تمھاری بیٹی شہرت کی کن بلندیوں پر جا پہنچی ہے نیلم۔''

''اخلاقی حدود کو پار کرنا، شہرت کی بلندیوں کو چھونا ہے یا دوزخ کے راستے پر جانا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''پھر وہی راگ چھیڑ دیا تم نے۔'' احمد کھسیا گئے۔''تم کس صدی کی بات کر رہی ہو؟ آج عورت مرد کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ ہر میدان میں فتح کے پرچم لہرا رہی ہے۔ سائنسداں بن کر خلا میں جا رہی ہے تو ملک کی باگ ڈور بھی سنبھال رہی ہے۔''

''ان سب میں ایک وقار ہے، ایک شان ہے... یہ عورتوں کی آزادی کا انعام ہے۔لیکن عریانی اور فحاشی عورتوں کی آزادی کی تعریف میں نہیں آتی۔ اخلاقی اقدار کی حفاظت کل بھی عورتوں کی ذمہ داری تھی۔ آج بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔''

''چھوڑو یہ لیکچر بازی۔ شینا نے یہ تصاویر تمھارے لیے بھیجی ہیں۔''

میں نے ایک نظر ان تصاویر پر ڈال کر کراہیت سے کہا۔''یہ ننگی ٹانگوں والی عورت میری بیٹی نہیں ہے۔''

''عورت نہیں، لڑکی ہے وہ!''

''آر یو شیور؟'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا تو احمد گڑبڑا کر تصاویر اُلٹنے پلٹنے لگے۔

''میں اپنی بات پر قائم ہوں۔'' میں نے شینا کے میک اَپ زدہ چہرے پر نظریں گڑا کر

کہا۔ ''یہ ننگی ٹانگوں والی عورت میری بیٹی نہیں ہے۔ میری بیٹی شاہینہ تھی، جسے آپ نے مجھ سے چھین لیا ہے۔''

احمد خاموشی سے تصویریں سمیٹ لے گئے۔ بھلے ہی میرے سامنے خاموش رہ گئے ہوں، فون پر میں نے انھیں اپنے دوستوں کی مبارکباد ہنس ہنس کر قبول کرتے سنا۔ شبینا چند دِنوں کے لیے گھر آئی تو احمد نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پارٹی دی۔ مجھے نہ اُنھوں نے بلایا نہ میں خود گئی۔ بابا کی علالت کا بہانہ کر مہمانوں کو مطمئن کر دیا گیا۔

شبینا نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایک روز میں نے اسے ٹی وی پر ایک ری مِکس ویڈیو البم میں دیکھا۔ ری مِکس تجربے کے نام پر، شرافت اور تہذیب کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ری مِکس البم بنانے والے ایسی گمراہ لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو سنہرے پردے تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ وہ انھیں مختصر ترین کپڑوں میں کیمرہ کے سامنے کر دیتے ہیں کہ چار چھ انچ کی پٹّیاں جسم سے نہ ہٹاؤ پھر چوموچاٹو، جتنی چاہے اُتنی بے ہودگیاں کرو۔

شبینا کو تقریباً عریاں کولہے ہلاتے اور فحش حرکات کرتے دیکھ کر میں چیخ پڑی۔ ''احمد، سن رہے ہیں آپ۔ میں بہ ہوش وحواس یہ اعلان کر رہی ہوں کہ آج سے میری کوئی بیٹی نہیں... میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔''

''پکھراج! تم بھی بس انتہا کر دیتی ہو۔'' احمد نے نرمی سے کہا۔

''ہاں... یہ نفرت کی انتہا ہے... لیکن یہ حقیقت ہے جسے میں نے تسلیم کر لیا ہے۔''

ایک روز شبینا نے رات کو فون پر بہت دیر تک احمد سے بات کی۔ ریسیور رکھ کر وہ مجھ سے بولے۔ ''نیلم! شبینا کی پہلی فلم اناؤنس ہوگئی۔''

''تو؟؟؟'' میں نے سرد مہری سے کہا۔

''اسے مبارکباد نہ دوگی۔ آخر وہ تمھاری...''

''میں کسی شبینا کو نہیں جانتی۔'' میں نے کتاب اُٹھا کر اُس میں نظریں گڑا دیں۔

بی گریڈ کی فلم تھی۔ خزانے کی تلاش کے اِردگرد گھومنے والی۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے یونٹ جنگل میں مقیم تھا۔ شبینا بہت خوش تھی۔ صبح شام اپنے بابا کو فون کر کے شوٹنگ کے واقعات،

اپنے تجربات سے آگاہ کراتی۔ ایک روز فون نہیں آیا۔ احمد بے چین ہو گئے۔ رات گئی۔ دوسرا دن بھی بیت گیا۔ تیسرے روز فون کی گھنٹی بجی۔ طویل فاصلے کی کال تھی۔

''کیا یہ شبینا احمد کا مکان ہے؟''

''ہاں، مگر اس کے ڈیڈی گھر پر نہیں ہیں۔'' میں نے ریسیور رکھ دیا۔

پھر گھنٹی بجی۔ ''دیکھئے، ایک اہم خبر دینا ہے۔ شبینا احمد...''

میں نے پھر ریسیور رکھ دیا۔

اُسی وقت احمد آ گئے۔ تیسری مرتبہ گھنٹی بجی تو اُنھوں نے ریسیور اُٹھایا۔ ''ہلو!''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں پرائمری ہیلتھ سینٹر انچارج ڈاکٹر پانڈے بول رہا ہوں۔ فلم اسٹار شبینا احمد کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ آپ فوراً یہاں پہنچیں۔''

''حادثہ؟ کیسا حادثہ؟'' احمد اتنی زور سے چیخے کہ مجھے بھی اُس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

''وہ سات آٹھ اشخاص کی درندگی کا شکار ہوئی ہیں۔ اُن کا اغوا ہوا تھا۔'' پھر وہ اور کچھ کہتے رہے... میرا دِل اندر سے ٹوٹا جا رہا تھا پھر بھی جب احمد نے مجھے پورا واقعہ بتایا تو میں نے سنگ دِلی سے کہا۔ ''ننگی ٹانگوں والی عورتوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔''

''وہ ہماری بیٹی ہے زہرہ۔'' کئی برسوں کے بعد احمد نے میرا اصلی نام لیا۔ ''اس وقت اسے ہماری ضرورت ہے۔ خدا کے لیے میرے ساتھ چلو۔ میں اتنی لمبی ڈرائیونگ نہ کر سکوں گا۔ وہ ہمیں یاد کر رہی ہے۔'' احمد میرے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگے۔

گیارہ گھنٹوں کی مسلسل ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہم لوگ شبینا کے پاس پہنچے تب تک وہ خطرے سے باہر ہو چکی تھی۔ یونٹ والے اپنی صفائی پیش کرنے لگے مگر ہم نے خاموشی سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ پچھلی سیٹ پر شبینا باپ کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ میں ڈرائیو کر رہی تھی۔

میرے دماغ میں پریشان خیالات کی آندھی چل رہی تھی۔ احمد سے شادی، شبینا کی ولادت سے آج تک کے واقعات دماغ کی اسکرین پر آ جا رہے تھے۔ احمد نے کئی مرتبہ مجھے ٹوکا۔ ''زہرہ! راستہ خراب ہے۔ رفتار معمول پر رکھو۔ بریک پر دھیان رہے۔''

بریک لگانے کی بات پر مجھے 'کاکا' کی یاد آ گئی۔ انھوں نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ بد دماغ انسان تھے۔ ذرا ذرا سی غلطی پر بُری طرح ڈانٹ دیتے... 'آپ کبھی صحیح وقت پر بریک نہیں لگاتیں۔ آپ کو تو جیسے بریک پر پاؤں رکھنا آتا ہی نہیں... جب میں کہتا ہوں بریک لگایئے تو اتنی دیر بعد اس پر عمل کرتی ہیں کہ گاڑی کافی آگے نکل جاتی ہے۔ میں ایمرجنسی بریک نہ لگادوں تو حادثہ کردیں آپ۔ بریک کی اہمیت کو سمجھئے۔''

میں نے احمد سے کاکا کی شکایت کی تھی اور انھوں نے کاکا کو سمجھا دیا تھا کہ 'بھئی ہماری بیگم کو ڈانٹا ڈپٹا نہ کرو'۔

''زہرہ پلیز! گاڑی کی رفتار پر قابو رکھو'' احمد نے پھر مجھے خبردار کیا تھا۔

شبینا کو پہلی مرتبہ میری موجودگی کا احساس ہوا... ممّا بھی ہیں بابا...'' وہ احمد کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی— ''وہ درندے تھے بابا... درندے... میرے ساتھ بہت بُرا کیا اُنھوں نے۔''

میرے دِل کو جیسے کسی نے ہاتھوں میں لے کر مسل ڈالا۔ آخر کو میرے جسم کا حصّہ تھی وہ۔ جی چاہا کار ایک طرف کھڑی کر کے اُس کے پاس جا بیٹھوں، اُس کے زخموں پر ہاتھ رکھوں، اُسے سہلاؤں جس سے اُس کی تکلیف کم ہو جائے۔ بے خیالی میں میں نے بریک پر سے پاؤں اُٹھالیا۔

''بابا... یہ سب کیا ہو گیا بابا! میرے کیریئر کا کیا ہوگا؟ شبینا سسک رہی تھی۔

احمد بولے: ''جو ہو گیا اُسے بھول جاؤ شبینا۔ ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ جس کیریئر کو تم نے اپنایا ہے، وہاں یہ سب ہوتا ہی ہے...''

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یہ کیسی عورت ہے جسے اب بھی اپنے نقصان کی پرواہ نہیں، اپنے کیریئر کی فکر ہے... اور یہ کیسا باپ ہے جو اپنی بیٹی کو پھر اسی راہ پر جانے کے لیے اُس کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

میں نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

''زہرہ! کیا کر رہی ہو؟ کار اُلٹ جائے گی'' احمد دہشت زدہ ہو کر چیخے۔ ''رفتار کم کرو،

بریک لگاؤ۔''

''رفتار کم کروں؟ بریک لگاؤں...'' میں نے پلٹ کر ہذیانی انداز میں کہا۔'' آج تک تو آپ ہی کی رفتار سے چلتی آئی ہوں... نتیجہ سامنے ہے۔ میں نے بیٹی کو کھودیا... کاش! میں جہنّم کی راہ پر جانے سے پہلے ہی بیٹی کو روک لیتی۔ لیجیے، کر دی رفتار کم...''

دوسرے ہی لمحے میں سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بابا میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میرا ایک ہاتھ اُنھوں نے تھام رکھا تھا۔ دوسری طرف سے میری نند میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھیں۔ ڈاکٹر نے نپے تلے الفاظ میں کہا:'' بیگم احمد! مجھے نہایت افسوس سے یہ اطلاع دینی پڑ رہی ہے کہ آپ کے شوہر اور آپ کی بیٹی دونوں حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ آپ کی کار اُلٹ گئی تھی۔''

'ہاں! گاڑی کو تو اُلٹنا ہی تھا۔ میں نے فُل بریک جو لگا دیئے تھے۔' میں نے دِل ہی دل میں کہا، پھر کمرے میں موجود سب لوگوں پر نظر ڈال کر آہستہ سے کہا:'' حالانکہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح وقت پر بریک لگائے تھے۔''

○○

لاوارث

معصومہ آہستہ آہستہ کہنی کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ شدّتِ تکلیف سے آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دماغ پریشان خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دایاں ہاتھ بے خیالی میں اس گال کو سہلا رہا تھا جس پر جبّار کی انگلیاں اپنا نقش چھوڑ گئی تھیں۔ ذلت کے احساس سے وہ اندر سے ٹوٹی جا رہی تھی۔

یہ دُکھ یہ تکلیف اس طمانچے کی نہیں تھی۔ جبّار پہلے بھی کئی بار اُس پر ہاتھ چھوڑ چکا تھا۔ جبّار کی زبان کی تلخی، طنز اور اُس کے جذبۂ احساسِ برتری نے وقتاً فوقتاً جو گھاؤ معصومہ کے دِل میں کیے تھے وہ اس طمانچے سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ معصومہ نے زندگی گزارنے کا سبق شمع سے پایا تھا۔ پگھل پگھل کر اپنے وجود کا خاتمہ کر لینا اور اپنے کچھ نہ ہونے کا احساس اُس کی بجا خواہشات کے اظہار میں ہمیشہ مانع رہا۔ اپنے اطراف پھیلی ہوئی خوشیوں میں اپنا حصہ جان کر جب اُس نے ہاتھ بڑھایا، کمتری کا احساس زیادہ ہو گیا۔

عورت کو سسرال میں کانٹا بھی چبھتا ہے تو میکے میں جا کر رو لیتی ہے۔ معصومہ کے میکے میں کون تھا جو اُسے اپنی آغوش میں چھپا کر، اُس کے زخموں پر ہمدردی کا مرہم رکھتا۔ ماں سے اسے کبھی وہ شفقت وہ پیار نہ ملا تھا جو ایک بیٹی کا حق اور ماں کہلائی جانے والی ہستی کا خاص وصف ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے تینوں بیٹوں ہی کو اپنی کل کائنات سمجھے ہوئے تھی۔ جس دِن معصومہ پیدا ہوئی تھی اُسی دن اُس کا باپ ایک حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ معصومہ کے قدم کی نحوست نے اُس کی ماں کی محبّتوں کو دائمی نفرت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جنم دینے والی ماں کا یہ حال تھا تو پھر بھائی بھابی کیا پوچھتے؟

بچپن سے محرومیوں میں پلی بڑھی معصومہ نے اپنے مستقبل سے بہتری کی اُمیدیں لگا رکھی تھیں۔ ہر نوجوان لڑکی کی طرح اُس نے بھی خواب دیکھے تھے۔ وہ خواب، جن میں اپنے آپ کو کسی کے پیار کا مرکز بنا دیکھا تھا۔ کسی کی محبّتوں میں سرشار، پیار کے ہنڈولے میں جھولتا دیکھا تھا لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہ اُسے شوہر بھی وہ ملا جس کی محبّت پہلے ہی کئی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔

جبّار کی ایک بیوہ خالہ معصومہ کے گاؤں میں تھیں۔ اُن کے کھیتوں کا تنازعہ چل رہا تھا۔ اکثر جبّار گاؤں آیا کرتا۔ معصومہ کے بھائیوں نے دیکھا، پرکھا اور جبّار سے معصومہ کی شادی کردی گئی۔

جبّار بڑی بڑی آنکھوں والا، خوبصورت ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ معصومہ خوش تھی۔ اُس نے زندگی میں کبھی چھوٹی سی خوشی بھی نہ پائی تھی۔ جبّار کا قرب اُس کے لیے دُنیا کی گراں بہا دولت سے بڑھ کر تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ وہ مزاج کا بہت خراب تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر سختی سے باز پرس کرتا، مگر دس باتیں سنا کر معصومہ کو پیار سے پکار لیتا تو معصومہ سب کچھ فراموش کر دیتی۔ ہنس کر بات کرتا تو اپنی خوش قسمتی کو سراہنے لگتی۔

عورت کے لیے زندگی میں محبّت کا فلسفہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اُس کا دل بیحد فراخ ہوتا ہے۔ جہاں وہ دوسروں کو ڈھیروں محبت بانٹنا چاہتی ہے وہاں کسی کے تھوڑے سے پیار، تھوڑی سی توجہ کی طلب گار ہوتی ہے۔

معصومہ کی کہنی میں چوٹ لگی تھی۔ اچانک اُس میں درد کی ایک تیز لہر اُٹھی تو اس کا دھیان بٹ گیا۔ دیوار کا سہارا لے کر اُس نے گھٹنے موڑ لیے اور کہنی کو دیکھنے لگی۔ ذہن پھر بھٹکنے لگا۔

معصومہ کی خوشیوں کا دَور بے حد مختصر تھا۔ شادی کے بعد دس پندرہ دِنوں تک اُس نے پاس پڑوس میں جھانکا بھی نہ تھا۔ جبّار کو یہ ذرا بھی پسند نہ تھا۔ اُس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، دن بھر بیٹھ کر پڑوسنوں کے ساتھ باتیں بنانے والی عورتیں مجھے پسند نہیں۔ جس وقت میں لوٹ کر آؤں گھر میں موجود ملا کرو۔ عورتوں کے ساتھ باتیں بنانے کی بجائے، عورت کا سج سنور کر شوہر کا انتظار کرنا زیادہ معتبر ہے۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دسویں درجہ تک ہندی میڈیم اسکول، مشن کا ایک چھوٹا سا اسپتال،

چار جماعتوں تک اُردو اسکول، گاؤں میں مسلمانوں کے صرف دس پندرہ مکان۔ اکثریت جاٹوں اور ہریجنوں کی تھی۔

پڑوس میں خیرون کا مکان تھا۔ اُس کا شوہر جبّار کے ساتھ ہی اُردو اسکول میں پڑھاتا تھا۔ ایک دن ساس بہو معصومہ سے ملنے چلی آئیں۔

معصومہ کے خوابوں کا محل اپنی بنیاد سے اُکھڑ کر گر پڑا۔ خیرون نے بتایا جبّار کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ دو بچّے ہیں جو ننیہال میں رہتے ہیں۔

ساس بہو کب اُٹھ کر چلی گئیں اُسے پتہ ہی نہ چلا۔ وہ گم سم بیٹھی سوچتی رہی، جبّار، اُس کی پہلی بیوی اور بچّوں کے بارے میں۔

جبّار گھر آیا تو معصومہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جبّار کے دِل میں وہ آج تک اپنی تنہا حکومت سمجھتی آئی تھی لیکن آج اُسے معلوم ہوا جبّار کی محبت کا بٹوارہ تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ وہ بہت دیر میں پہنچی اور اب خالی دامن لیے کھڑی ہے۔

جبّار سے اُس نے ہچکیوں کے درمیان ایک موہوم سی اُمید کے سہارے استفسار کیا تھا... شاید وہ کہہ دے... یہ جھوٹ ہے... کسی نے تم سے غلط بیانی کی ہے... لیکن جبّار نے کہا... ''میں نے تمھیں دھوکہ نہیں دیا۔ تمھارے گھر کے افراد کو خالہ نے بتا دیا تھا۔ تمھیں اُن لوگوں نے نہیں بتایا... کوئی مصلحت ہوگی نہ بتانے میں... تمھیں یقین نہ آئے میری بات کا تو پوچھ لو جا کر...''

معصومہ رونا بھول گئی۔ حقیقت اُس کے سامنے عیاں ہو کر آ گئی... جبّار بغیر کسی جہیز کے اُسے قبول کرنے کو تیار تھا... ماں، بھائی بھابیوں کو اور کیا چاہیے تھا؟

رو رو کر جینا معصومہ کی قسمت بن گیا۔ زندگی پھر وہی ریگستان بن گئی جہاں دُکھوں کے بگولوں کا راج تھا۔ جبّار کی محبت کے سائے میں پناہ لینے دوڑی تھی وہ سراب کے سوا کچھ نہ نکلا۔

کئی دِنوں تک وہ چھپ چھپ کر روتی رہی تھی۔ نئی صورتِ حال۔ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی رہی تھی۔ آخر کار اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ دِل میں یہ سوچے ہوئے تھی کہ جبّار اُس کے اس اقدام سے خوش ہوگا مگر اس کی عالی ہمّتی، عالی ظرفی اس کے منہ پر ماردی گئی۔ جبّار ہر ماہ بچّوں سے ملنے، اُن کا خرچ دینے جایا کرتا۔ اس روز وہ جانے لگا تو معصومہ نے سامنے آ کر کہا:

''آپ بچّوں کو یہاں لے آیئے۔''

''کس لیے؟ نانا نانی اُن کی مناسب طور طریقے سے پرورش کر رہے ہیں۔''

''آپ انھیں لائیں تو سہی۔ مجھ سے کوئی کوتاہی ہو تو بے شک یہاں نہ رکھیں۔''

''جی ہاں۔'' وہ طنز سے بولا۔ ''جیسے میں نے سوتیلی مائیں دیکھی ہی نہیں۔''

معصومہ نے اب بھی ہار نہ مانی۔ ''اچھا تو مجھے ساتھ لے چلئے بچوّں کو مجھے جاننا چاہیے۔''

''جی نہیں... کوئی ضرورت نہیں۔''

معصومہ رُہانسی ہوگئی۔ ''آپ سمجھتے کیوں نہیں، بڑے ہو جانے پر وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھیں گے۔''

''سوال ہی نہیں اُٹھتا، وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔''

جبّار بات ختم کر کے چل دیا تھا۔ معصومہ کے لیے بات اب شروع ہوئی تھی۔ وہ بچوّں کو گھر کیوں نہیں لانا چاہتا تھا؟ بچوّں کی حق تلفی کے ڈر سے... یا خود پر پڑ جانے والی دوہری ذمہ داری کے ڈر سے۔ اُس کے مزاج کا کوئی پہلو معصومہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پہلی بیوی کا وہ بھولے سے بھی تذکرہ نہ کرتا۔ خیرون کی ساس نے ہی بتایا تھا کہ پہلی بیوی سے بھی اس کا سلوک ٹھیک نہ تھا۔ جب تک اولاد نہ ہوئی تھی جبّار نے ایک لمحہ بھی خوشی کا اسے نہ دیا تھا۔ بچوّں کی پیدائش کے بعد آپسی جھگڑے کم ہوگئے تھے، معصومہ نے سوچا، یقیناً وہی اپنے آپ کو بچوّں سے بہلائے رکھنے لگی ہوگی۔

خیرون کی ساس نے اُس دِن اس کے سامنے دل کی بہت سی باتیں کھول کر رکھ دی تھیں، ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا: ''بیٹی! اپنے پیٹ کی ایک اولاد تو ہونی ہی چاہیے۔''

خیرون کا شوہر اُس کا سوتیلا بیٹا تھا اور خیرون اپنی ساس کو جیسا رکھتی تھی معصومہ کو خوب پتہ تھا۔ وہ کہا کرتی، 'ہنہ! کون سی ان کی سگی ماں ہیں کہ میں اُن کی خدمت کروں۔ سوتیلی ماں بن کر آئی ہوں گی تو کیا نہ کیا ہوگا میرے شوہر کے ساتھ'، جب تک خیرون بہو بن کر نہ آئی تھی خیرون کا سسر اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتا تھا، مگر جب وہ خود بیٹے کی کمائی پر منحصر ہوگیا تو بیٹے اور بہو کی بولی بولنے لگا۔ غریب عورت دانے دانے کو ترس کر رہ جاتی تھی۔ خیرون کے سسر کے مرنے کے بعد تو آدھی پگلاسی گئی تھی۔

موسم تیزی سے بدل رہے تھے۔ جبّار کے معمول میں فرق آیا نہ معصومہ کی زندگی کی

کتاب میں کوئی سنہرا ورق جڑا۔ جبار پر گویا اُس کے نان نفقہ ہی کی ذمہ داری تھی جسے وہ بڑی خوش اسلوبی سے نبھائے جا رہا تھا۔ زن و شوہر کے بیچ جو ایک خوش آئند خیال شادی کے فوراً بعد سے پنپنے لگتا ہے وہ اپنے قدم کہاں رکھتا؟ یہاں سے وہاں تک اصولوں کی سنگلاخ زمین بکھری پڑی تھی۔

عورت کا سب سے بڑا دُکھ اس کا بانجھ ہونا نہیں ہے۔ سب سے بڑا دُکھ ماں بننے کے تصور سے اُسے محروم کر دینا ہے۔ معصومہ نے دُنیا بھلے ہی نہ دیکھی ہو، عورت کا وجود تکمیل کو کب پہنچتا ہے یہ کسی عورت کو کہیں سیکھنے نہیں جانا پڑتا۔ معصومہ کی شادی شدہ زندگی کے چار سالوں میں کبھی ایک لمحہ بھی ایسا نہ آیا جب جبار نے اُس کے ساتھ بیٹھ کر مستقبل کا کوئی پلان بنایا ہو۔ کبھی یہ پوچھا ہو کہ اُس کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ جب وہ اپنے بچوں سے ملنے جاتا ہے تو تنہائی کے جان لیوا لمحات سے کیوں کر جوجھتی ہے؟

معصومہ کا حلق خشک ہو آیا تھا۔ اُٹھ کر اُس نے ایک گلاس پانی پیا۔ لمحہ بھر خلا میں دیکھتی رہی پھر فرش پر بیٹھ گئی۔ آج وہ اپنی زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹ کر دیکھنا چاہتی تھی... اُس کا قصور کیا تھا...؟

اُس دن جبار نے پہلی مرتبہ اُس پر ہاتھ اُٹھایا تھا اور معصومہ نے جانا تھا کہ جسمانی مار سے پھر بھی زبان کی مار زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ شام کے کھانے کے بعد اُس نے جبار کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا تھا: ''میں آج مشن اسپتال گئی تھی خیرون کی ساس کے ساتھ۔''

جبار کچھ نہ بولا۔

''کیا مجھے نہیں جانا چاہیے تھا؟'' جبار کی خاموشی سے مشکوک ہو کر وہ بولی تھی۔

''اچھا کیا!'' وہ لاتعلقی سے بولا۔

جبار نے پوچھا نہیں وہ مشن اسپتال کیوں گئی تھی؟ گویا وہ جانتا تھا۔ اُسے پوچھنا چاہیے تھا ڈاکٹر نے کیا کہا؟ اُس نے پوچھا نہیں۔ معصومہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے شرم بن کر خود ہی بولی: ''ڈاکٹر نے چھوٹا آپریشن کروانے کو کہا ہے۔''

''کروا لو۔'' جبار نے سرد مہری سے کہا جیسے اس بات کا اُس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

جبار کی یہ بے تعلقی معصومہ کو کھل گئی۔ پست لہجے میں بولی،

''کیا آپ نہیں چاہتے میں ماں بنوں؟''

''میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟''

معصومہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اُس نے ہمیشہ دیکھا تھا جبار کبھی اُس کا دِل رکھنے کی بات نہیں کرتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا اُسے ذلیل کرتا۔ اُس کی دلآزاری سے اُسے خاص رغبت تھی۔ جبار کے مزاج کا یہ اہم پہلو تھا۔ معصومہ فطرتاً ٹھنڈے مزاج کی تھی۔ چُپ کے سہنے اور غم اُٹھانے کی عادی تھی۔ بڑی سے بڑی بات کو بھی چہرے پر کوئی تاثر لیے بغیر برداشت کر جاتی۔ بعد کو چاہے تنہائی میں گھنٹوں رویا کرتی۔ اس وقت بھی دل چیخ چیخ کر رونے کو ہو رہا تھا مگر بظاہر بڑے پرسکون انداز میں اُس نے کہا تھا،

''ایک بات کہوں... آپ اگر کنوارے ہوتے... آپ کی پہلی شادی نہ ہوئی ہوتی، آپ کے یہ بچّے نہ ہوتے... تب بھی آپ ایسا ہی کہتے...؟''

جبار کا ہاتھ گھوم کر معصومہ کے سر پر پڑا۔ اُس نے معصومہ کے بالوں کو پکڑ کر سر دیوار سے ٹکرا دیا، غصّے سے بے قابو ہو کر بولا تھا: ''بہت لمبی زبان ہوگئی ہے تیری۔ چار کلاس کیا پڑھ گئی ہے اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتی ہے... میرے بچّوں کو نظر لگاتی ہے معمولی کُتیا کو دیکھو دس بچّے لیے پھرتی ہے۔ تو اگر بانجھ نہ ہوتی تو اب تک بچّہ نہ پیدا کر لیتی...''

معصومہ فق رہ گئی۔ جی چاہا چیخ کر کہے تم نے اتنی جلد میرے بانجھ ہونے کا فتویٰ کیسے دے دیا؟ کبھی میرا علاج کروایا ہوتا۔ زندگی بھر بانجھ رہنے والی عورت بھی دواؤں اور دعاؤں کا سلسلہ اس وقت تک بند نہیں کرتی جب تک عمر کا ہرکارہ اُسے نااُمیدی کا پیغام نہیں سنا دیتا۔ معصومہ کی اُمیدوں کا تو ابھی آغاز تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کرنے کو پڑا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔ بس سسک سسک کر روتی رہی تھی۔ یہ بھی پوچھنے کا یارا نہیں رہا تھا کہ اُس نے غلط کیا کہا ہے؟

زندگی پھر انھی لگے بندھے اصولوں پر چلنے لگی۔ خواہش کرنا اور پانے کے لیے مچلنا اُس نے سیکھا ہی نہ تھا مگر ارمانوں اور حسرتوں کی راکھ میں چنگاری رہ رہ کر بھڑک اُٹھتی، چھوٹا آپریشن،... آپریشن کروانے کے لیے کس کی طرف دیکھتی؟ اسپتال مشن کا تھا، خرچ نہ لگتا پر دیکھ بھال کرنے کو بھی تو کوئی ہوتا؟ میکے والوں نے شادی کر دینے کے بعد خبر بھی نہ لی تھی کہ زندہ ہے

یا مر گئی۔ خیرون کی سانس ہی آگے آئی۔ دو دن تک اسپتال میں ساتھ رہی۔ جبار کے کھانے پینے کی ذمہ داری خیرون نے اپنے سر لے لی تھی۔

اسپتال سے لوٹی تو دل پر ایک اور چرکہ لیے ہوئے... بازو والے بیڈ پر جو عورت تھی اس کا بھی اُسی دن آپریشن ہوا تھا۔ دل شکستہ معصومہ کو رات میں روتے ہوئے دیکھا تو اُسے دلاسہ دیا۔ عورت ہی عورت کے دُکھ کو سمجھتی ہے۔ معصومہ کے دل کو ڈھارس بندھی تو یوں ہی پوچھ لیا،

''تمھارے کتنے بچّے ہیں بہن؟''

''تین ہیں... دو لڑکیاں، ایک لڑکا... میرے شوہر تو چاہتے تھے ایک لڑکا اور ہو جائے مگر مجھے اب بچّہ نہیں چاہیے تھا اس لیے...'' کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی۔ کچھ شرمندہ سی ہو کر بولی:

''تمھاری شادی کو کتنا عرصہ بیتا بہن؟''

معصومہ گلا بھر آنے سے کچھ نہ بول سکی۔ وہ عورت کہتی رہی: ''یہ مرد بھی عجب ہوتے ہیں بہن! عورت کا قصور ہو تب تو سزا بھگتے گی ہی، قصوروار نہ ہو تب بھی موردِ الزام ٹھہرائی جائے گی۔ میں اب تمھارا دُکھ سمجھ سکتی ہوں۔ تمھارے شوہر تمھیں دیکھنے کے لیے بھی نہیں آئے ناراض رہتے ہوں گے تم سے کہ تم انھیں اولاد نہیں دے سکی ہونا'...

معصومہ کی کہنی کی چوٹ تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی۔ اُٹھ کر کھڑی ہونے لگی تو سر زور سے چکرایا۔ دماغ پر خیالوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ کھڑی ہونے کا ارادہ ترک کر کے اُس نے دیوار سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کرتے ہی خیالات کی کڑیاں جڑُنے لگیں۔

ایک سال گزر جانے کے بعد وہ پھر مشن اسپتال گئی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا تھا پرچے پر دوائیں لکھتے ہوئے ڈاکٹر نے اسے ایک مشورہ دیا جسے سن کر ہی وہ بجھ سی گئی تھی۔ گھر لوٹ کر تمام دن طاقت یکجا کرتی رہی جبار سے وہ بات کہہ دینے کے لیے... ایک آخری کوشش وہ کر لینا چاہتی تھی جبار کے آنے کے بعد، کئی بار کچھ کہنا چاہ کر اُس کے قریب گئی مگر کہہ نہ سکی۔ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو نیند نہ آئی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ جبار کی طرف کروٹ لے کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے الفاظ یوں اُگل دیے جیسے اب بولے گی نہیں تو سینے میں دَم گھُٹ جائے گا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے آپ ایک بار معائنہ کروالیں۔''

جبّار نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ غضب ناک ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ ''میں کہتا ہوں تمھیں اس کے سوا اور کچھ سوجھتا بھی ہے؟ مجھ پر الزام لگاتی ہو؟ میں کیوں معائنہ کرواؤں؟ میں دو بچّوں کا باپ ہوں... میرے پاس ثبوت ہے میری مردانگی کا...''

اتنے کڑے وار سے معصومہ اندر تک چھدتی چلی گئی۔ زخمی لہجے میں بولی: ''میں نے ڈاکٹر کو بتایا تھا... اُس نے کہا پھر بھی ضروری ہے... ہو سکتا ہے اتنے برسوں میں...''

سیدھا حملہ جبّار کی نااہلیت پر ہوا تو ہوش و حواس گنوا بیٹھا۔ بھلے بُرے کی تمیز نہ رہی۔ پل بھر میں معصومہ کی پاکیزگی اور شرافت کو داغدار کر دیا، بے تکان گالیاں بکیں پھر بھی جی نہ بھرا تو معصومہ کو دُھن کر رکھ دیا۔

معصومہ کے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ رواں رواں خوف و نفرت سے کھڑا ہو گیا۔ دایاں ہاتھ جو اَب تک کہنی کی چوٹ سہلا رہا تھا اب آنچل سے گالوں پر بہتی ہوئی آنسوؤں کی دھاروں کو روک رہا تھا۔

جبّار نے اس ایک خوشی کے سوا اُسے زندگی کی سب خوشیاں دینے کی کوشش کی تھی، مگر کیا کیا جائے کہ وہ عورت تھی اور عورت کی فطری خواہش تخلیق کرنے کی ہوتی ہے۔ جس روز سے جبّار نے اپنی اہلیت کے ثبوت میں اپنے بچّوں کا حوالہ دے کر اُسے زدوکوب کیا تھا معصومہ نے اپنے ذہن کے اُن تمام دریچوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا جو کبھی کبھی ہی، چاہے چند لمحوں ہی کے لیے اُسے شگفتہ کرنے کے قصوروار ہوتے تھے۔ وہ گھٹ گھٹ کر مر جانا چاہتی تھی جس طرح کی زندگی جبّار اُسے جینے پر مجبور کرنا چاہتا تھا وہ جی نہیں سکتی تھی۔ مر جانا بھی آسان نہ تھا۔ زندگی اگر صرف سانس کے آنے جانے کا نام ہوتی تو وہ جبّار کی مرضی کے مطابق ہی زندگی بسر کرتی، مگر اس کی وہ خواہش، وہ تمنا بھی تو زندگی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

جبّار نے بات کرنا کم کر دیا تو معصومہ نے بالکل ہی بند کر دیا۔ دونوں چپ چاپ اپنی جگہوں پر جئے جا رہے تھے۔ اس دن جب معصومہ جبّار کے لیے کھانا لگا رہی تھی تو ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ دِل میں پکتا لاوا ذرا سی ٹھیس سے پھٹ پڑے گا۔

وہ سبزی میں نمک ڈالنا بھول گئی تھی۔ جبّار نے ایک دَم آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا تھا: ''میری سمجھ میں نہیں آتا تمھارا دھیان کہاں رہتا ہے؟ اپنے عاشقوں کی یاد میں کھوئی رہتی

ہوگی۔ اس سے اچھا کھانا تو نوکر بنا کر دے سکتا ہے۔"

"تو ایک نوکر رکھ لیجیے۔ وہی کھانا بنا کر کھلائے گا۔" معصومہ نے نمک لانے کے لیے جاتے ہوئے چڑ کر کہا۔

"تو کون سے میرے بچّے پال رہی ہے کہ تیرے لیے نوکر رکھوں..."

"ہاں... ہاں..." اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی معصومہ جوش سے بے قابو ہو کر چیخ پڑی: "کھانا نوکر بنا کر دے سکتا ہے۔ گھر کا خرچ آپ چلاتے ہی ہیں۔ پھر آپ کو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھ میں اور ایک داشتہ میں فرق ہی کیا ہے؟ میں آپ کے بچّوں کی ماں نہیں بن سکتی پھر کیوں آپ نے مجھ سے شادی کا سوانگ رچایا؟ آپ کو بستر کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی... بستر کے لیے ساتھی تو پانچ روپے میں بھی مل جاتا ہے۔"

"منہ بند کر اپنا... ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" جبّار نے خونخوار نظروں سے اُسے گھورا تھا۔ "میں تمھیں مانگنے تمھارے گھر نہیں گیا تھا۔ تم ہی بھائیوں پر بوجھ ہو رہی تھیں۔ نہیں تو کون یوں بنا پوچھ تاچھ کیے لڑکی کا نکاح پڑھا دیتا ہے، وہ بھی اِس صورت میں جبکہ میں نے تمھاری ماں کو بتا دیا تھا کہ مجھے اَب اولاد کی خواہش نہیں ہے..."

"کیا... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" معصومہ کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا... اُس نے اُن ماؤں کو دیکھا تھا جو بیٹی کو اولاد نہ ہونے پر درگاہوں اور مندروں کی مٹّی چاٹتی پھرتی ہیں۔ بیٹی کی گود ہری ہو جائے اس لیے فقیروں، سادھو سنتوں کے آستانوں پر ماتھا ٹیکتی ہیں۔ ڈاکٹروں، حکیموں کی پناہ لیتی ہیں... خدا کے آگے گڑگڑاتی ہیں... دان پُن... خیر خیرات کرتی ہیں... مگر... مگر...

جبّار کی آواز پگھلے سیسے کی مانند کانوں میں اُترتی جا رہی تھی... "تمھاری قسمت میں اولاد ہوگی تو ہو جائے گی... یہ سب تمھاری ماں کو سوچنا چاہیے تھا۔ اور تم یہ پوچھتی ہو کہ مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی تو سنو..."

وہ قریب آ کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا: "میں نے شادی حرام کو حلال کرنے کے لیے کی ہے ورنہ بستر کے لیے ساتھی پانچ روپے تو کیا... ایک روپے میں بھی مِل جاتی ہے... اب دوبارہ یہ سوال نہ اُٹھانا۔ دوسرے لوگ اپنی بیویوں کو جیسا رکھتے ہیں جو کھلاتے پلاتے ہیں... اُس سے کہیں اچھا رکھتا ہوں، بہتر کھلاتا پلاتا ہوں، چار لوگوں میں عزّت ہے اور کیا چاہیے تمھیں..."

معصومہ کو جیسے کسی نے سرِ بازار عریاں کر دیا ہو۔ شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ شرم سے زیادہ ذلّت کا احساس تھا۔ ٹانگوں کا خون کھنچا جا رہا تھا، لہرا کر فرش پر بیٹھ گئی تھی، شدّتِ غم سے تھکی سی بولی تھی۔ ''کیا عورت کی معراج یہی ہے؟ عورت جب مرد سے تنہائی کی شکایت کرتی ہے تو وہ جواب میں، گھر کے کاموں میں دِل بہلانے، بازار میں اپنے حسن کی نمائش کرنے، بازار میں رنگینیوں میں خود کو گم کر دینے کی بات نہیں سننا چاہتی... وہ چاہتی ہے وہ مرد، اُس کا شوہر... اُس کی اولاد کی خواہش پر لبیک کہے... میں نے اپنے میکے میں کبھی نہ جانا پیار کیا ہوتا ہے؟ میں نے سوتیلی ماؤں کو، سوت کے بچّوں سے ٹوٹ کر پیار کرتے دیکھا ہے مگر اپنی حقیقی ماں کا پیار نہیں دیکھا، بھائیوں کی چاہت نہیں دیکھی کیونکہ میری آنکھ کے کھلنے سے میرے باپ کی آنکھیں مُند گئی تھیں... کیا یہ میرا قصور تھا؟ آپ کے گھر آئی تو آپ نے سونے کے نوالے کھلائے مگر احسان کی چاشنی میں لپیٹ کر۔ مخمل پہنایا... پاؤں کی جوتی سمجھ کر... گھر میں رکھا ایک خدمت گار کی طرح... آپ کی شریکِ حیات ہونے کے جو حقوق مجھے ملنے چاہیے تھے میں اُن سے محروم رہی... میں پیار کے لیے ترستی رہی۔ کبھی مجھ سے پیار کے دو بول تو بولتے؟ ساری زندگی اُنھیں دِل میں چھپا کر گزار دیتی... پیار سے ایک ٹکڑا لاتے... سر آنکھوں پر رکھتی... میں نے آپ سے کبھی نہیں پوچھا آخر کس جرم کی پاداش میں مجھے ذلیل کیا جاتا ہے؟ سزا دی جاتی ہے؟ کبھی آپ نے سوچا ہی نہ ہوگا کہ میرے دِل میں بھی کچھ ارمان پلتے ہیں۔ خواہشات سر اُٹھاتی ہیں۔ اُنھیں کون پورا کرے گا؟ آپ نے کبھی تصوّر کیا ہے... جب بڑھاپا تیزی سے مجھے اپنی بانہوں میں لینے آگے بڑھے گا تب میں کیا کروں گی؟ کس طرح... کس کے سہارے دِن گزاروں گی... آپ پر بڑھاپا آئے گا آپ اپنے بیٹوں کے پاس چلے جائیں گے...''

''جاؤں گا کیوں نہیں''، جبّار بھڑک اُٹھا۔ ''کیا تمھاری طرح لاوارث ہوں؟ تم بہت بکواس کرنے لگی ہو۔ میں آج مر جاؤں تو لاوارث کُتیا کی طرح سڑکوں پر ماری ماری پھرو گی... نہ کوئی آگے نہ پیچھے... کون پوچھے گا تمھیں؟''

''آپ مجھے لاوارث کہہ رہے ہیں؟ ایک شوہر کا اپنی بیوی کو یہ کہنا زیب دیتا ہے؟ معصومہ غصّے سے اُٹھ کھڑی ہوگئی۔ ''آج تک میں نے سادگی میں لوگوں کے بولنے کا خیال نہ کیا... اب کیوں نہ بولوں؟ کیا یہ ممکن نہیں آپ نے مجھ سے شادی کرنے سے پہلے ہی آپریشن...''

''کمینی عورت!'' جبار نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ پہلے ہی تھپڑ میں وہ تیورا کر گری تھی۔ کہنی کمرے میں بنی ہوئی موری سے ٹکرا کر زخمی ہوگئی تھی۔ ''بنا منہ کو لگام دیئے بولے چلی جاتی ہے۔ عورت کی حیثیت ہے ہی کیا؟ پاؤں کی جوتی... آج پہنی، کل بدل دی... تجھے لاوارث سمجھ کر تجھ سے نباہ کر رہا تھا۔ ابھی گھر سے نکال دوں تو بھٹکتی پھرے گی۔ کسی چکلے میں جا کر بیٹھے گی یا گلی گلی میں بھیک مانگے گی۔ آخری بار تجھ سے کہتا ہوں اپنی اوقات نہ بھول... ورنہ کھدیڑ دوں گا گھر سے باہر'' اسے ٹھوکر مار کر وہ نکل گیا تھا۔

ذہن میں چلتی ہوئی ریل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی... معصومہ خیالوں کی دُنیا سے لوٹ آئی۔ زندگی کی کتاب کے اس تکلیف دہ باب کو وہ یہیں ختم کر دینا چاہتی تھی۔ ذہن آگے سوچنے سے انکار کر رہا تھا۔ مگر وہ سوچنا چاہتی تھی.. ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گالوں پر سرخ نشان، کہنی میں چوٹ اور خون کی مانند سرخ آنکھیں۔ جبار کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی... لاوارث... تو لاوارث ہے''

شام تک اُسے بخار چڑھ آیا... مگر آنکھوں میں ایک عزم جاگ رہا تھا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اُس نے خیرون کو آواز دی... وہ آئی۔ معصومہ کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی مگر ہمیشہ کی طرح جبار کی زیادتی سمجھ کر کوسنے لگی۔ معصومہ نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ رُندھی آواز میں بولی:
''بہن! مجھے دس روپے دو۔ لاوارث بھکارن سمجھ کر دے دو۔ میں واپس نہ کر سکوں گی''

دس روپے پکڑا کر خیرون بچّے کے رونے کا بہانہ کر کے بھاگی۔ معصومہ سمجھ گئی۔ وہ اپنی ساس کو جبار کی تلاش میں بھیجے گی۔ وقت کم تھا اُس نے شال اُٹھا کر اپنے جسم کے گرد لپیٹا، باہر نکل کر کواڑ کی سانکل لگائی اور ڈگمگاتی ڈولتی چل پڑی۔

کس طرح وہ اسٹیشن پہنچی، کیسے ٹکٹ لیا۔ کب ٹرین میں سوار ہوئی اُسے کچھ پتہ نہ تھا۔ شہر کے اسٹیشن پر جب وہ اُتری رات کے دو بج رہے تھے۔ بخار تیز ہو چکا تھا، اُسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں بھی دقّت ہو رہی تھی ایک تانگے والے کو سرکاری اسپتال چلنے کے لیے کہہ کر وہ سوار ہوگئی۔

ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ تیکھی سرد ہوائیں اُس کے جسم کو تیر کی طرح چبھ رہی تھیں، مگر معصومہ کے دل کا طوفان کہیں زیادہ بھیانک تھا۔

اسپتال پہنچ کر تانگہ رُکا۔ اُس نے مٹھی میں دبے روپے اور شال تانگے والے کو پکڑا دیئے اور اسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئی۔

سویرے اسپتال کی نرس نے ڈاکٹر کی طرف ایک پرچہ بڑھاتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر! رات جو عورت ہمیں کمپاؤنڈ میں بے ہوش پڑی ملی تھی اُس نے سویرے پانچ بجے دَم توڑ دیا۔ موت سے پہلے اُس نے یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔''

ڈاکٹر نے کاغذ لے کر پڑھا، ٹوٹے پھوٹے خط میں لکھا تھا...

''میں لاوارث ہوں، میرا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ موت کے بعد میری لاش میڈیکل کالج کے طلباء کے لیے وقف کر دی جائے۔''

OO

سہارے زندگی کے

سُونا گھر شاہینہ بیگم کو کھانے دوڑ رہا تھا۔ ایما اپنے ساتھ گھر کی رونق ہی لے گئی تھی۔ کمال خوبصورتی سے اُس نے سارا گھر سنبھال رکھا تھا۔ رحمان صاحب اور شاہینہ بیگم اس کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ وہ دو روز کے لیے بھی کہیں جاتی تو گھر کا سارا انظام گڑبڑ ہو جاتا۔ شاہینہ بیگم کو باورچی خانے میں تیل مسالے کے ڈبّے ملتے نہ رحمان صاحب کو موزے رومال۔ وہ لوٹ کر آتی تو شاہینہ بیگم کہتیں: ''بیٹی تو ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جایا کر۔ اوّل تو مجھے سوجھتا ہی کم ہے دوسرے تیرے ابا رہے سہے ہوش بھی گم کر دیتے ہیں۔ ایما بھی ہنس کر جواب دیتی۔ ''نہیں جاؤں گی امّی... ابا نہیں جاؤں گی آپ لوگوں کو چھوڑ کر... غلطی ہوئی آئندہ نہ ہوگی...'' وہ کان پکڑ کر توبہ کرتی۔

مگر ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ کسی نے خوشی سے بیٹی کو گھر میں ہی رکھ لیا ہو، سسرال نہ بھیجا ہو۔ اچھا رشتہ ملتے ہی ایما کی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ روتی آنکھوں اور مسکراتے چہروں سے ان ہی رحمان صاحب اور شاہینہ بیگم نے بیٹی کو رخصت کیا جو اسے اپنے سے جدا کرنے کے نام سے ڈرتے تھے۔ بہوئیں آئی ہوئی تھیں مگر شاہینہ بیگم اُداس تھیں۔

شعیب اور حسیب کی بیویوں نے بمشکل پانچ چھ ماہ سسرال میں بتائے تھے پھر اپنے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ ویسے بھی آج کل کی بہوؤں سے یہ توقع ہی فضول ہے کہ وہ ساس سسر کی خدمت کو شوہر کی رفاقت پر فوقیت دیں گی۔

حسیب کی پوسٹنگ ابتدا سے پونہ میں تھی۔ صبا خوش تھی۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی پونہ چلی گئی تھی۔ نہ کبھی ساس سسر کو وہاں بلایا تھا نہ اکلوتی نند کو لے گئی تھی۔ عید پر دونوں آ جاتے اور

دیوالی کی تعطیلات میں چار پانچ روز بچوں کے ساتھ گزار جاتے۔

شعیب نے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد نئی ملازمت جوائن کی تھی۔صدف نے اسے تبادلے کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا۔شعیب نے درخواست تو دی ہی،صدف کے بھائی نے بھی کوشش کی پھر بھی چھ ماہ بعد تبادلے کے احکامات ملے۔صدف نے یہ عرصہ بڑی مشکل سے سسرال میں گزارا۔ایما کی ہم عمر تھی،اس سے تو نبھ گئی اس کی،مگر ساس شاہینہ بیگم سے ہمیشہ کھٹ پٹ ہوتی رہتی۔صدف ہمیشہ اس بات کی شاکی رہی کہ شاہینہ بیگم ایک بہو کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد دوسری کو اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتی ہیں۔اسی لیے اس کے ہر کام میں کیڑے نکالتی ہیں۔اس کے اس رویے سے تنگ آ کر شاہینہ بیگم نے اسے ٹوکنا بولنا قطعی چھوڑ دیا تھا۔شعیب کی پوسٹنگ بمبئی ہوئی اور وہ صدف کو ساتھ لے گیا تو شاہینہ بیگم کو سکون ملا۔

رحمان صاحب اگلے ماہ ریٹائر ہو رہے تھے اس لیے بھی انھوں نے ایما کی شادی میں جلدی کی تھی وہ جانتے تھے کہ آدمی جب تک اقتدار میں ہے تب تک ہی اس کی قدر ہے۔بعد میں کوئی نہیں پوچھتا۔اور واقعی ان کے آفس والوں نے شادی میں ان کا بہت ساتھ دیا۔

ایما پہلی مرتبہ سسرال سے واپس آئی تب تک مہمان رخصت ہو چکے تھے۔صرف ایک چچا جان رہ گئے تھے جنھیں آفس کے کام سے کلکتہ جانا تھا اور ریزرویشن پہلے نہیں مل سکا تھا۔ ایک روز وہ یونہی پوچھ بیٹھے: ''بھائی جان اب آپ نے کیا سوچا ہے۔ایما بیٹی اپنے گھر کی ہوگئی۔آپ یہیں جمے رہیں گے یا شعیب،حسیب کے گھر جائیں گے۔رحمان صاحب نے بیٹوں کی طرف نظر ڈال کر کہا۔''میں کیا سوچوں گا۔یہ تو ان لوگوں کے سوچنے کی بات ہے۔''

شعیب نے حسیب کو دیکھا،دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات کی پھر وہ بولا:

''یہ اپنا ذاتی مسئلہ ہے ابا جان!بہتر ہوگا اگر ہم اس پر تنہائی میں بات کریں۔''

رحمان صاحب برافروختہ ہو کر بولے:''یہ ذاتی مسئلہ ہے تو کیا تمھارے چچا غیر ہیں؟وہ اس گھر کے ایک فرد ہیں،میرے سگے بھائی ہیں،تم نے اُن کی بے عزتی کی ہے۔''

عرفان خجل ہو کے بولے:''چھوڑیں بھائی جان۔شعیب نے صحیح کہا ہے۔مجھے آپ لوگوں کے ذاتی معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔''

رحمان صاحب نے بار بار عرفان سے معافی مانگی مگر بات ان کے دل کو لگ گئی تھی۔ بظاہر تو کچھ بولے نہیں لیکن کبیدگی چہرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ بہرحال ان کی موجودگی میں یہ موضوع زیرِ بحث نہ آیا۔ کلکتہ روانہ ہونے سے پہلے شعیب نے ان سے معافی بھی مانگ لی تھی مگر تنہائی میں — عرفان صاحب کے تین بیٹے تھے اور خدا کی مہربانی کہ تینوں ہی نہایت لائق اور فرمانبردار تھے اس لیے بھی بھتیجے کی نافرمانی اور گستاخی انھیں بہت بُری لگی تھی۔

جس روز شعیب کو واپس لوٹنا تھا اس سے پہلے دن، رات کو سب لوگ بیٹھک میں جمع ہوئے۔ صبا اور صدف بچّوں کو لے کر پڑوس میں چلی گئیں۔ شاہینہ بیگم نے روکا تو صبا نے نہایت بے رُخی سے کہا: ''ہم لوگ بھی تو غیر ہیں۔''

''نہیں... تم ہمارے گھر کی بہو ہو۔ تم غیر کیسے ہو سکتی ہو؟'' شاہینہ بیگم نے سادگی سے کہا۔

''نہیں۔ آپ لوگ اپنا مسئلہ خود حل کریں۔ ہم کچھ کہیں گے تو الزام ہم پر آئے گا۔''

رحمان صاحب اور شاہینہ بیگم اچھی طرح جانتے تھے کہ دونوں نے خوب چابی بھر دی ہے۔ اب ان کے میاں وہی بولیں گے جو وہ چاہیں گی، اس لیے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔

''میرا مشورہ ہے ابا کہ آپ ایک ہمہ وقتی ملازمہ رکھ لیں۔ وہ باورچی خانہ بھی سنبھالے گی اور آپ لوگوں کی دیکھ بھال بھی کرے گی۔'' شعیب نے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

''اور خرچ کیسے چلے گا؟'' ایما نے دریافت کیا۔

''ہم دونوں ہر ماہ دو سو روپیہ ابا امّی کو بھیجا کریں گے۔'' حسیب نے کہا تو شعیب نے فوراً مخالفت کی۔ ''میں دو سو روپیہ ہر مہینے نہیں بھیج سکتا۔ بمبئی کا خرچ ہے میرا۔''

''تو ٹھیک ہے، سو روپیہ مہینہ ہم دونوں بھیجیں گے۔'' چالاکی سے کام لے کر حسیب نے اپنے بھی سو روپے بچا لیے۔ ''ابا کو پنشن بھی ہزار روپے کے قریب ملے گی۔''

''لیکن بھائی جان!'' ایما نے کہا۔ ''آپ لوگ ابا امّی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے۔ امّی گٹھیا سے نالاں ہیں تو ابا بلڈ پریشر سے... ہم میں سے کسی نہ کسی کو ان کے پاس ہونا چاہیے۔''

شعیب اور حسیب دونوں خاموش رہے تو ایما نے پھر کہا۔ ''یا آپ دونوں میں کوئی اپنا ٹرانسفر یہاں کرا لے۔''

''ایما...'' شعیب نے کہا۔ ''ٹرانسفر کروا لینا ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

''وہ ایسا ہے بیٹی کہ بیوی چاہے تو ٹرانسفر آسانی سے اور جلدی ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کے لیے بھی کوئی ٹرانسفر کراتا ہے بھلا۔'' رحمان صاحب نے آرام کرسی پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

شعیب چڑ گیا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایمانے کہا: ''تو ایسا کریں، چھ ماہ آپ اور چھ ماہ چھوٹے بھائی جان امّی ابا کو ساتھ رکھیں۔''

''نہیں میرا فلیٹ اتنا بڑا نہیں ہے کہ دو زائد آدمی وہاں رہ سکیں۔'' حسیب نے جلدی سے کہا۔

شعیب نے حسیب کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کتنی آسانی سے چھوٹ گئے تم، پھر کچھ سوچتا ہوا بولا: ''میرے ساتھ مکان کا مسئلہ نہیں ہے لیکن امّی کی صدف سے پٹتی نہیں ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر صدف کے پیچھے پڑیں گی۔ جب تک برداشت کر سکے گی وہ کرے گی مگر پھر وہ بھی جواب دے گی۔ جھگڑا ہوگا۔ میرے بنگلے میں اَردلی کام کرتے ہیں وہ باہر جا کر کہیں گے... میری بدنامی ہوگی۔''

''بہت خوب۔'' رحمان صاحب سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے: ''اپنی امّی کے لیے، بہو کے پیچھے پڑے رہنے کے الفاظ استعمال کرنے کا شکریہ۔''

''معاف کریں ابا... امّی آپ بھی معاف کریں، نادانی میں کچھ کہہ بیٹھا ہوں، ویسے گستاخی کرنے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔''

''رہنے بھی دیں، ذرا ذرا سی بات نہ پکڑیں بچّوں کی۔'' شاہینہ بیگم نے کہا: ''میں نے قطعی بُرا نہیں مانا۔ شعیب کے دِل میں کچھ نہیں ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں اس کے سینے میں دِل بھی نہیں ہے اسی لیے وہ ماں کی محبت کو بھی فراموش کر گیا ہے۔'' رحمان صاحب نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''تم کیا کہتے ہو حسیب؟''

''امّی میرے ساتھ چلیں۔'' حسیب نے کہا۔ ''میرا فلیٹ وَن بیڈ روم فلیٹ ہے مگر گیلری خاصی بڑی ہے۔ میں نے ملازمہ کو دے رکھی تھی خالی کرالوں گا۔''

''اور کیا... ماں پر احسان بھی ہو جائے گا اور مُفت کی ملازمہ بھی مل جائے گی۔'' رحمان صاحب نے پھر طنز کیا۔ ''میرا مطلب ہے تمھاری امّی خالی تو بیٹھی نہیں رہیں گی۔ ملازمہ کو جواب دے دینا، ان سے کام لینا۔''

''ابا آپ کی زبان میں زہر ہے۔'' حسیب چڑ کر بولا۔ ''میں نے کب کہا ہے کہ امّی سے

گھر کے کام کرواؤں گا۔"

"جب تم لوگ چھوٹے تھے تب میری زبان میں زہر نہیں تھا بیٹے۔ تمھیں بڑا کرنے میں ساری مٹھاس ختم ہوگئی... حالات نے میری زبان کی مٹھاس کو زہریلا بنا دیا ہے۔ تمھارے چچا جان نے بھی تین بیٹوں کی پرورش کی ہے، ان کے بیٹے ان کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت کر رہے ہیں اس لیے ان کی زبان کی مٹھاس اب بھی قائم ہے... کانٹے بوؤ گے تو کانٹے ہی پاؤ گے بیٹے... ہاں تو میں شعیب کے ماتھے مارا جارہا ہوں مگر شعیب، بہو سے بھی پوچھ لیا ہے۔"

شعیب تلملا گیا... شاہینہ بیگم موقع کی نزاکت بھانپ گئیں، بولیں: "لیکن بیٹے اس ضعیفی میں ہمیں ایک دوسرے سے الگ کیوں کرتے ہو؟"

"مجبوری ہے امّی، حسیب کے فلیٹ میں جگہ نہیں ہے۔"

"آپ کے مکان میں تو ہے۔" ایما بولی۔ "جگہ مکان میں نہیں دِل میں ہونی چاہیے... مگر آپ سوچتے ہیں کہ میں ہی کیوں ذمّہ داری اُٹھاؤں۔"

"بہت گھسا پٹا جملہ بولا ہے تم نے۔" شعیب تلخی سے بولا: "جمعہ جمعہ چار دِن ہوئے ہیں شادی کو۔ اُونٹ پہاڑ کے نیچے آئے گا تب حقیقت سے دوچار ہوگی۔ دیکھیں سسرال والوں سے کیسے نبھاتی ہو۔"

"آپ بھی دیکھ لینا۔" ایما نے اعتماد سے کہا۔ "اس طرح نبھاؤں گی کہ لوگ مثالیں دیں گے۔ ابّا اور امّی کی اس بے قدری سے سبق سیکھ رہی ہوں۔ میری ساس اب تک اپنے ساس سسر سے نباہ رہی ہیں۔ میں ان کی روایت قائم رکھوں گی۔ دادا دادی ہی کی نہیں ساس سسر کی بھی خدمت کروں گی اور وقت آیا تو امّی ابّا کو بھی سنبھالوں گی۔"

"شکریہ بیٹی۔ تمھارا اتنا کہنا ہی کافی ہوا۔ تم اپنا گھر سنبھالو۔ ہماری بھی کسی طرح گزر ہی جائے گی۔" شاہینہ بیگم نے پیار سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو طے یہ ہوا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بیگم حسیب کے ساتھ اور میں شعیب کے ساتھ جا کر رہوں گا۔" شعیب حسیب خاموش رہے، تو انھوں نے پھر کہا۔ "اس مکان کا کیا کریں گے؟"

"اسے فروخت کردیں اور رقم ہم دونوں میں بانٹ دیں۔" شعیب نے تجویز پیش کی۔

"مناسب مشورہ ہے، لیکن ترمیم کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔" رحمان صاحب نے کہا۔

''تم لوگوں پر پہلے یہ واضح کر دوں کہ میرا فنڈ وغیرہ سب میں نے ایما کی شادی میں خرچ کر دیا ہے۔اب میرے پاس جمع پونجی کے نام پر یہ مکان باقی بچا ہے۔مکان فروخت کرنے پر جو رقم آئے گی اس کے پانچ حصے کیے جائیں گے۔تم دونوں کے دو، ایما کا ایک اور میرا اور بیگم کا ایک ایک حصہ۔''

''ایما کا کیوں؟'' حسیب اور شعیب نے بے اختیار پوچھا۔

''ایما کا کیوں نہیں؟ وہ بھی تو تم دونوں کی طرح میری اولاد ہے۔''

''آپ نے اسے پون لاکھ کا جہیز دیا ہے۔'' شعیب نے کہا۔

''تم لوگوں پر میں نے ایک ایک لاکھ خرچ کیا ہے۔اب تک ایما نے اسی شہر میں، ہمارے پاس رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔تم دونوں کے داخلے کے وقت ڈونیشن دیا گیا تھا... تمھارا ہوسٹل کا خرچ اُٹھایا گیا تھا... ملازمت کے وقت بھی موٹی رقم خرچ کی ہے پھر تمھاری شادیاں کیں۔'' رحمان صاحب توقف کر کے بولے۔''تم دونوں کے حصے کی رقمیں تمھیں فوراً مل جائیں گی۔ایما کے حصے کی رقم فکسڈ ڈپازٹ میں رہے گی۔ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے حصے کی رقم البتہ تم دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہو جائے گی۔''

حسیب غصے سے اُبل کر بولا: ''کیوں؟ اس میں سے بیٹی کو حصہ نہیں دیں گے؟''

''مرچیں نہ چباؤ بیٹے... یہ ہمارا پشتینی مکان نہیں ہے، میری محنت کی کمائی ہے... میں جس طرح تم لوگوں کی بہتری کا سوچتا ہوں اسی طرح بیٹی کے مستقبل کی بھی فکر ہے مجھے۔''

ایما روہانسی ہو کر بولی: ''مجھے نہیں چاہیے کچھ۔''

''تمھیں ابھی دے کون رہا ہے؟ بس تمھارا حصہ محفوظ کیا جا رہا ہے، جس سے ہماری موت کے بعد... ارے ہاں، موت پر سے یاد آیا... ہم دونوں میاں بیوی ساتھ تو مرنے سے رہے، یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟''

''کون سا مسئلہ؟'' حسیب اور شعیب نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بھئی ہماری ذمہ داری تم دونوں آدھی آدھی بانٹ رہے ہو۔فرض کرو پہلے میں مر گیا تو کیا تم اپنی امی سے یہ کہو گے کہ آپ بھی مر جائیں، بھائی کا بوجھ ہلکا ہوا، میں کیوں آپ کو سنبھالتا پھروں؟''

''اُٹھو حسیب۔'' شعیب جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔''ابا سے بات کرنا فضول ہے۔''

حسیب، شعیب بیوی بچوں کے ساتھ لوٹ گئے۔ایک روز شاہینہ بیگم کو اُداس بیٹھا دیکھ کر رحمان صاحب نے کہا:''بیٹوں کی یاد آ رہی ہے کیا؟''

''نہیں ایما کی یاد آ رہی ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں:''بیٹی گھر سے چلی جائے تو گھر کتنا اُداس ہو جاتا ہے۔''

''ہماری بیٹی ایک دوسرا گھر روشن کر رہی ہے۔ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیے کہ ہم نے ایک اولاد تو ایسی پیدا کی جو کسی گھر کو جنّت بنا رہی ہے۔بزرگوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن رہی ہے...شوہر کی صحیح معنوں میں دوست اور غمگسار ہو گئی ہے۔کل خان صاحب ملے تھے،ایما کی بہت تعریف کر رہے تھے۔میرا دِل خوشی سے بھر گیا۔ایک ہماری بہوئیں ہیں۔''

''دیکھئے جی بہوؤں کی بات نہ کیجیے۔ہر لڑکی کا مزاج الگ ہوتا ہے۔سال چھ مہینے میں وہ لوگ یہاں آتی ہیں۔بچوں سے ہمیں ملاتی ہیں بس اور کیا چاہیے ہمیں۔کیوں ان کی بات کر کے اپنا خون جلاتے ہیں۔'' شاہینہ نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیگم یہی خوبی ہے آپ میں۔ہم دونوں کے سوچنے کے انداز میں فرق نہیں ہے۔فرق وہاں ہو جاتا ہے جب آپ خاموشی کو ترجیح دیتی ہیں اور میں حرفِ شکایت زبان پر لے آتا ہوں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کروں کہ میں نے حسیب،شعیب کی مالی مدد قبول نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔میں ان کے منی آرڈر لوٹا دوں گا۔''

''نہ...ایسی غلطی نہ کریں۔'' شاہینہ بیگم نے کہا۔''انھیں ٹھیس پہنچے گی۔آپ منی آرڈر وصول کر لیں۔رقم چاہے استعمال نہ کریں۔بینک میں جمع کراتے رہیں ورنہ جب ہمیں حقیقت میں ضرورت ہوگی تب وہ مدد نہیں کریں گے۔بُرا وقت سب پر آ سکتا ہے۔ہم پر بھی،ہمارے بچوں پر بھی۔اس بُرے وقت میں یہ روپیہ کام آئے گا۔آپ ایسا کریں،دالان کے پاس کے دو کمرے کرایہ پر دے دیں۔آپ کی پنشن اور کرایے کی رقم سے ہمارا گزارا بخوبی ہو جائے گا۔''

''بجا فرماتی ہیں آپ۔'' رحمان صاحب نے بیگم سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔''دالان کے ساتھ والے کمرے خالی کر دیں اور ساتھ ہی باورچی خانے کے بازو والے کمرے کا کاٹھ کباڑ بھی نکال پھینکیں،وہاں بھی ایک مکین آئے گا۔''

''وہ کس لیے؟'' شاہینہ بیگم نے دریافت کیا۔

''آپ بھول گئیں ہمارے بیٹے ہمیں ایک ملازمہ رکھنے کے لیے مشورہ دے گئے ہیں۔''
رحمان صاحب نے یاد دلایا۔ ''آپ نے سکینہ کے تعلق سے اس روز کہا تھا کہ اسے ہم اپنے پاس رکھ لیں گے۔ وہ وقت بھی آ گیا ہے۔ اس کی عدت کے دن پورے ہو گئے ہوں گے۔ ایما کی طرح وہ بیٹی بن کر ہمارا گھر سنبھالے گی۔ مرحوم چچا، چچی کی رُوح کو بھی سکون ہوگا کہ ان کے بعد ان کی بچی کو سہارا مل گیا۔ درحقیقت اس وقت اسے ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی... وہ بے سہارا ہو گئی ہے... ہم بے سہارا کر دیئے گئے ہیں... زندگی اسی کا تو نام ہے...''

○○

سوال کا جواب

نیلوفر کو گزرے پانچ دِن ہو چکے ہیں۔

کل مجھے واپس جانا ہے۔ بھابی جان سے اجازت لینے کی سوچ کر میں ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ بھیا دفتر اور بچّے اسکول گئے تھے۔ عثمان بھی اپنے کسی دوست کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ موقع اچھا تھا۔ مجھے بھابی جان سے نیلوفر کے بارے میں بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ ظاہر تھا کہ نیلوفر کے ذکر پر وہ برافروختہ ہو جاتیں۔ موت والے گھر میں تماشہ نہ ہو اس لیے میں بھابی جان سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھی۔

بھابی جان کے مزاج سے جتنا میں واقف ہوں، اُتنی نیلوفر ان کی مزاج داں نہیں تھی۔ اُس نے ہمیشہ بھابی جان سے کچھ زیادہ ہی اُمیدیں وابستہ کیں اور ہمیشہ منہ کی کھائی۔ کسی کی بات پر یقین کر لینا، ہر کسی پر اعتماد کر کے دل کی بات کہہ دینا نیلوفر کی عادت تھی اور اسی لیے بے خبری میں ماری گئی۔

بھیا کی جب شادی ہوئی، نیلوفر چھوٹی تھی۔ میری شادی طے ہو چکی تھی۔ سال دو سال میں، میں اپنے گھر کی ہو جانے والی تھی اور نیلوفر کو بھیا بھابی کو بہت سال سنبھالنا تھا۔ شاید اسی لیے نیلوفر بھابی جان کو پھوٹی آنکھ نہیں سہاتی تھی۔

''صنوبر! رُک کیوں گئیں؟ اندر آ جاؤ۔'' مجھے دروازہ پر کھڑا دیکھ کر بھابی نے آواز دی۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ریکارڈ پلیئر چل رہا تھا۔ میرے اندر داخل ہونے پر بھابی جان نے اُٹھ کر ریکارڈ پلیئر بند کر دیا۔ خود پلنگ پر بیٹھ کر مجھے نزدیک بیٹھنے کا اشارہ کیا...

''بیٹھو۔''

’’میں نے بیٹھتے ہوئے کہا: ’’بھابی جان، کل ہم لوگ جانا چاہتے ہیں۔‘‘

وہ مجھے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ پتہ نہیں کیا سوچ رہی تھیں۔ میں نے اجازت طلب کی۔ ’’جائیں نہ ہم دونوں؟‘‘

بھابی جان نے ایک طویل سانس لے کر کہا: ’’جاؤ، خوشی کا کوئی موقع ہوتا تو روکتی... یہاں رہوگی تو نیلوفر کی یاد ستائے گی۔‘‘

’’میری آنکھیں اشکبار ہوگئیں... کئی روز سے ذہن میں اُبھرتا سوال میں نے داغ دیا۔ ’’بھابی جان، نیلوفر کے سامان میں میرے لیے کوئی خط نہیں تھا؟‘‘

بھابی جان یکایک پھٹ پڑیں۔ ’’خط کیوں ہوتا؟ پہلے سے تو کچھ معلوم نہیں تھا... جو کچھ ہوا قطعی غیر متوقع طور پر ہوا۔ حادثہ کے بارے میں پتہ ہوتا تو کیا میں اُسے وہاں لوٹنے دیتی؟ تمھاری بہن تھی تو میرے شوہر کی بھی بہن تھی۔ ہم نے اُسے پڑھایا لکھایا، اُس کی شادی کی... کیا ہمیں اُس سے پیار نہیں تھا؟‘‘

میں نے زخم خوردہ نظروں سے اُنھیں دیکھا۔ بھلا یہ بھی کوئی موقع تھا ان باتوں کا۔ موقع ملتے ہی وہ اپنے احسان جتانے لگتی تھیں۔ پھر اُن کی وہ قینچی کی طرح چلنے والی زبان! میں نے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا: ’’اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو مجھے نیلوفر کا سامان دیکھنے دیں۔ شاید میں اپنے لیے کوئی پیغام تلاش کرلوں۔‘‘

بھابی جان ایک جھٹکے سے پلنگ سے اُتر کر کھڑی ہوگئیں۔ ’’دیکھنا کیا ہے؟ اُٹھا کر لے جاؤ سب۔ دو سوٹ کیس ہیں۔ برتن، کپڑے، زیورات تو سب اس کے شوہر نے دبا لیے۔ میں نے امّی جان سے کہا بھی تھا کہ پورا زیور ایک ساتھ نہ دے دیں مگر وہ سمجھتی تھیں کہ میری نظر ہے اُن کے سونے پر۔ سارا زیور بیٹی کو دے کر کنگال ہوگئیں۔ بھلا پھر بیمار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ دو مہینے اسپتال میں رہیں۔ ہمارے ہزاروں خرچ کرادیئے۔‘‘

’’بھابی... بھابی جان... مہربانی کر کے مرے ہوؤں کو کچھ نہ کہیں۔‘‘ میں رو پڑی... ’’موت، بیماری، مصیبت کہہ کر تو آتی نہیں۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے... میں کیا یہ حقیقتیں سمجھتی نہیں۔‘‘ بھابی کا دماغ گرم ہی ہوتا گیا۔ ’’مگر کیا آدمی کو اپنے بڑھاپے کا انتظام پہلے ہی نہیں کرلینا چاہیے؟ کچھ رقم بینک میں رکھتیں تو ہم شاید

زیادہ اچھے ڈھنگ سے ان کی خدمت کر سکتے تھے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے علاج کروا سکتے تھے۔ مہنگی سے مہنگی دوا خرید سکتے تھے مگر وہ تو سب کچھ بیٹی کو دے کر ننگی بچّی ہو گئی تھیں اور پھر ہم کون سے دھنا سیٹھ ہیں۔"

میں نے کانوں میں انگلیاں دے کر آنکھیں بند کر لیں۔ اماں کی موت کا منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ نیلوفر کا تار پا کر میں بھاگم بھاگ پہنچی تھی مگر اماں نے میرے پہنچنے سے پہلے نیلوفر کی گود میں دَم توڑ دیا تھا۔ میں غم سے بے حال تھی اس لیے بہت سی باتوں کو دیکھ کر بھی مناسب وقت کے انتظار میں رہی۔ سوئم کے بعد میں نے نیلوفر سے تنہائی میں پوچھا: "اماں کو جنرل وارڈ میں کیوں رکھا گیا؟"

"صنوبر باجی! ایک چپ ہزار بلائیں ٹالتی ہے۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ بھیّا سے پوچھوں گی۔" میں تڑپ کر بولی تھی۔ "اگر وہ اماں کا علاج کروانے سے معذور تھے تو مجھے لکھتے، میں روپیوں کا انتظام کر دیتی۔"

نیلوفر بے اختیار روتی ہوئی میرے گلے سے لگ گئی تھی... "باجی، مجھے بھابی جان کے پاس ہی رہنا ہے۔ سن لیں گی تو ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔ میری خاطر خاموش رہ جایئے۔"

"بی صنوبر!" بھابی جان کی کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "کان اور آنکھ بند کر لینے سے سچّائی پر پردہ نہیں پڑ جایا کرتا۔ یہ رہے نیلوفر کے سوٹ کیس! جو چاہے لے جاؤ۔ مجھے کیا؟"

بھابی جان نے نیلوفر کے سوٹ کیس کھول کر رکھ دیئے اور خود بھی وہیں بیٹھ گئیں۔ میں نے ایک ایک کر کے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھنے شروع کیے۔

"صنوبر! کُل بارہ ساڑیاں ہیں۔ چھ تم رکھ لو، چھ میں رکھ لیتی ہوں۔ اتنی قیمتی ساڑیاں کسی کو بانٹ بھی تو نہیں سکتے۔ اُس خبیث نے سب کچھ تو ہضم کر لیا۔ پتہ نہیں اتنے کپڑے کیسے واپس کر دیئے۔"

سوٹ کیس میں سب سے نیچے ایک ساڑی پر نظر پڑتے ہی میرے دل کو جیسے کسی نے بھینچ دیا۔ میں نے اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا: "بھابی جان! یہ سب ساڑیاں آپ رکھ لیں۔ میں صرف یہی ساڑی لوں گی۔"

''اب ایسا بھی کیا؟ میں کپڑوں کی بھوکی تو ہوں نہیں...مگر ہزار ہزار کی ساڑیاں پھینکی بھی تو نہیں جاسکتیں۔'' بھابی نے تیوریاں چڑھائیں۔

وہ پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہیں۔ اُس ساڑی کو سینے سے لگائے میں ایک مرتبہ پھر ماضی میں پہنچ گئی تھی۔

پانچ سال پہلے گھر میں نیلوفر کی شادی کی دھوم تھی۔ وہ امّاں کی لاڈلی تھی۔ بھیّا بھی اُسے مجھ سے کچھ زیادہ ہی چاہتے تھے۔ میں خود اُسے بہت پیار کرتی تھی۔ گھر کی آخری شادی تھی... خوب ارمان نکالے ہم نے... پانچ دِن پہلے ہی گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا... ہر دن عید تھی... ہر رات شبِ برات۔ خریداری شروع تھی۔ زیورات بن کر آچکے تھے۔

چچا جان تین روز پہلے آئے۔ مجھے بلا کر ایک بڑی رقم میرے ہاتھ میں دے کر بولے: ''صنوبر بیٹی! تمھاری شادی میں تمھیں تحفہ نہیں دے سکا تھا، اب اس رقم سے تم اپنے اور نیلوفر کے لیے دو شاندار ساڑیاں خرید لاؤ۔''

''مگر چچا جان! شادی تو نیلوفر کی ہے۔'' میں نے اعتراض کیا تو وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے... ''اب تو جو کچھ دوں گا... دونوں بھتیجیوں کو دوں گا۔ خدا کی قسم تمھاری دادی جان ناراض نہ ہوتیں تو میں تمھاری شادی میں ضرور شریک ہوتا۔''

چچا جان اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے تھے۔ وہاں ایک امریکن لڑکی لوسی سے شادی کر لی۔ بس دادی جان نے قسم دے دی ''میرے سامنے آؤ تو میرا مُرا منہ دیکھو۔'' چچا جان لوٹ کر نہیں آئے۔ اب اتنے سالوں بعد آئے تھے۔ میں ان کے اصرار کے آگے مجبور ہوگئی۔ نیلوفر کو ایک سہیلی کے گھر لے جانے کا کہہ کر ہم دونوں بازار بھاگے۔

کئی ساڑیاں دیکھنے کے بعد نیلوفر نے ایک ساڑی پسند کی۔ ''باجی، آپ بھی اسی طرح کی ساڑی لیں۔'' وہ ضد کرنے لگی۔ میں نے کہا: ''نہیں، بہت شوخ رنگ ہے۔ تم گوری بھوری، میں کالی سلونی۔ یہ لال رنگ مجھ پر نہیں کھلے گا۔''

''اونہہ باجی! مجھ سے اُنیس بیس ہی تو ہیں... ناک نقشہ تو آپ کا مجھ سے اچھا ہے... اچھی لگے گی یہ ساڑی... ہم جب کسی تقریب میں ایک جیسی یہ ساڑیاں پہن کر جائیں گے تو سب کہیں گے دیکھو... دو بہنیں آرہی ہیں...''

ہم نے ساڑیاں خرید لیں... بھیا کے پہلے منّے کی بسم اللہ کی تقریب میں ہم دونوں نے وہ ساڑیاں پہنیں۔ پھر موقع ہی نہیں آیا۔ اُس نے جانے میں کتنی جلدی کی!

"صنوبر بی بی! جانے والی آپ کے آنسو بہانے سے لوٹ نہیں آئے گی"، بھابی نے ٹوکا تو میں چونک پڑی۔ میں رو رہی تھی۔ ساڑی ایک طرف سے بھیگ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں پونچھ کر کہا: "بھابی! یہی ساڑی میرے لیے کافی ہے۔"

میری ساڑی میری نند کو پسند آ گئی۔ میں نے لاکھ کہا 'دوسری کوئی بھی لے لو'۔ وہ نہیں مانی... بولی: "دو چار مرتبہ پہن کر واپس کر دوں گی۔" مگر اُس کے گھر چوری ہوئی تو اور کپڑوں کے ساتھ وہ ساڑی بھی چوری ہو گئی۔ نیلوفر نے ایک دو مرتبہ مجھ سے پوچھا بھی کہ 'باجی وہ ساڑی کہاں ہے؟' میں نے دھوبی کے گھر دُھلنے کے لیے دی ہے کہہ کر بات کو ٹال دیا۔ اب وہی ساڑی میری نیلوفر کی یادگار بن کر مجھے پھر مل گئی تھی۔

"لو... یہ دوسرا سوٹ کیس بھی دیکھ لو"، بھابی جان نے اتنی ساری ساڑیاں پا کر فراخ دِلی سے کہا۔ "میں نے ساڑی ایک طرف رکھ کر دوسرا سوٹ کیس دیکھنا شروع کیا۔ کچھ اُس کے کپڑے، کچھ ننھے منّے ٹوپی کرتے۔ (نیلوفر سات ماہ بعد ماں بننے والی تھی) ایک البم اور ایک ڈبیہ میں سونے کا ایک لاکٹ۔ میں نے ڈبیہ بھابی جان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیجیے، آپ کو شکایت تھی نا کہ امّاں نے آپ کو کچھ نہیں دیا۔ اسے رکھ لیجیے۔"

میں پھر ماضی کی یادوں میں کھو گئی... نیلوفر کی شادی میں امّاں نے اپنا تمام زیور ختم کر دیا۔ کچھ کو تڑوا کر نیلوفر کے لیے نئے زیور بنوائے۔ کچھ کو فروخت کر بھیّا کو شادی کے لیے رقم دی۔ بھابی جان نے بھیّا کو بہکایا... "امّاں سارا زیور ختم کیے دے رہی ہیں۔ کیا آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہماری دو دو بیٹیاں ہیں۔ اُن کی شادی میں کیا زیور نہ دینا ہوگا۔"

بھیّا ہارے ہوئے لہجے میں بولے تھے: "بیگم، ہماری بیٹیاں ابھی بہت چھوٹی ہیں۔ اُن کی فکر نہ کرو۔ اور رہا زیور، تو امّاں کا ہے... امّاں جسے چاہے دیں۔ سچ پوچھو تو زیور فروخت کرتے وقت مجھے بڑی شرم آئی۔ میری ملازمت جانے سے ساری جمع پونجی ختم نہ ہو جاتی تو امّاں کے زیور فروخت کر کے میں بہن کی شادی نہ کرتا۔ بھائی ہوں، اپنے بَل بوتے پر اُس کی شادی کرتا۔"

بھیا کی طرف سے نا اُمید ہو کر بھابی جان نے اماں کو سمجھایا۔ ''اماں، کچھ بچا کر بھی رکھیے، کل کو دوسرے مواقع آئیں گے تب دینا دلانا ہوگا... پھر کہیں لڑکا خراب نکلا اور بیچ کر کھا گیا تو؟''

بھابی جان نے نہ جانے کون سی منحوس گھڑی میں وہ الفاظ منہ سے نکالے تھے کہ بالکل ویسا ہی ہوا۔ نیلوفر کے شوہر نے جوئے کی لت میں اپنی پُرسکون زندگی میں آگ لگادی۔

نیلوفر شادی کے بعد پہلی مرتبہ مائیکے آئی تو ہمیں کچھ اندازہ نہ ہوا، مگر دوسری مرتبہ آئی تو سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی... ہم نے جب اُسے کریدا تو وہ پھوٹ پڑی۔

نہ جانے کتنے لڑکوں میں سے بھیا نے اُسے پسند کیا تھا۔ انجینئر تھا، خوش شکل اور اسمارٹ تھا۔ مختصر خاندان تھا، ایک بہن تھی جس کی شادی نیلوفر کی شادی کے ساتھ ہوئی۔ ضعیف والدین آبائی گاؤں میں تھے۔ اُسے کلب میں جوا کھیلنے کی عادت پڑ گئی۔ جوئے میں ہارنے پر شراب پی لیتا اور گھر لوٹ کر نیلوفر پر ظلم کرتا۔ اُسے مارتا پیٹتا۔

میں تسلّی کے دو الفاظ کہتی اُس سے پہلے بھابی جان بول پڑتی تھیں: ''کچھ بھی ہو نیلوفر بی بی، وہ تمھارا مجازی خدا ہے۔ اُسی کے ساتھ تمھیں زندگی گزارنی ہے۔ نباہ کرو، جیسے بھی ہو۔''

میں نے بھی نیلوفر کو سمجھایا تھا کہ اپنے حسنِ سلوک اور محبت سے اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ بھیا نے بھی سمجھایا۔ میں خود نیلوفر کے بلانے پر عثمان کے ساتھ اُس کے گھر گئی مگر وہ اُلٹا ہم پر چڑھ دوڑا۔ اس قدر بے عزّتی کی ہماری کہ ہم اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔

ایک سال اور گزر گیا۔ نیلوفر کی ازدواجی زندگی اور تلخ ہوگئی۔ ہماری خواہش تھی کہ ایک ننھا مُنا بچّہ آجائے تو نیلوفر کا دِل بہل جائے گا۔ شاید باپ بن کر وہ خود بھی سدھر جائے مگر اللہ کو یہ منظور نہ ہوا۔ میں نے ہمیشہ اُس سے یہی کہا۔ ''جب تک نباہ کرسکتی ہو، کرو۔ جب ناکام ہو جاؤ تو بھیا کے پاس واپس آجانا۔''

بھیا نے بھی اُس سے یہی کہا تھا۔ اماں کے انتقال کے بعد وہی اُس کے سب کچھ تھے۔ باپ، ماں، بھائی... دوست... اور وہ ایک دن آخر آ ہی گیا جب نیلوفر اس حال میں واپس آئی کہ اُس کے سوچنے سمجھنے کی طاقت مفقود ہو چکی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ گھبرا جاتی اور رونے لگتی۔ ہنسنا مسکرانا بولنا اُس نے چھوڑ دیا تھا۔ بھیا کا ممتا بھرا دِل تڑپ اُٹھا... اُنھوں نے صاف

کہہ دیا۔ ''میری بہن، اب اُس قصائی کے گھر نہیں جائے گی۔''

بھابی جان کو جیسے ہی احساس ہوا کہ نیلوفر مستقل طور پر یہیں رہے گی اُن کا سلوک بدل گیا۔ بات بات پر طعنے دینے لگیں۔ مہنگائی اور گھر کے بڑھتے ہوئے خرچ کی دُہائی دینے لگیں۔ ایک دن نیلوفر سے بولیں: ''جسے اُس کے شوہر نے نہیں پوچھا اُسے کون پوچھے گا۔ جو اپنے شوہر کی نہ ہوئی وہ دوسروں کی کیا ہوگی... یہ تو ہمارا جگر ہے جو شادی کے بعد بھی تمھیں پال رہے ہیں۔''

نیلوفر ان تلخ باتوں کو برداشت کر جاتی۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑی تھی جس کے ایک طرف اُس کے شوہر کا گھر تھا جہاں اُسے شوہر کے ظلم اور بے اعتنائی کا شکار ہونا پڑتا تھا... دوسری طرف بھائی کا گھر تھا جہاں بھائی تو اُس کی دلجوئی کرتا تھا مگر بھابی چین سے جینے نہ دیتی تھی۔ بھابی جان نے بھیّا کو پٹی پڑھائی اور وہ اس بات کے لیے راضی ہو گئے کہ نیلوفر کو طلاق دلوا کر کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ اُس کی شادی کر دی جائے... لیکن نیلوفر راضی نہیں ہوئی۔ اُسے اُمید تھی کہ کبھی نہ کبھی اُس کا شوہر اُسے واپس لے جائے گا۔

بھابی جان کا سلوک حد سے زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تو نیلوفر مجھ سے صلاح لینے آئی اور میں نے اور عثمان نے مل کر اُسے طلاق کے لیے راضی کر لیا۔ میں نے بھیّا کو خط لکھ کر اطلاع دے دی۔ نیلوفر کو میرے یہاں بائیس دِن ہو گئے۔ بھابی نے ایک خط نہ لکھا۔ میں نے ہی ایک دن انھیں خط لکھ کر کہا کہ 'کم از کم اُسے تسلّی کے دو الفاظ تو لکھ دیا کیجیے'۔ مگر بھابی جان کسی اور ہی مٹی کی بنی تھیں... کبھی خیریت تک نہ پوچھی۔

دو تین روز سے نیلوفر بہت پریشان تھی... اُس نے بھیّا کے پاس لوٹنے کا اصرار کیا۔ میں نے اپنے دیور کے ساتھ اُسے بھیج دیا۔ اُس کی زرد رنگت اور مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میں نے نارمل اور پُرسکون رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اُس کے جانے کے چار روز بعد مجھے بھیّا کا تار ملا۔ 'نیلوفر کو اُس کے گھر پہنچا کر آیا ہوں'۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کہاں تو وہ طلاق کے لیے راضی ہو گئی تھی... کہاں یہ قدم اُٹھا لیا! میں نے فوراً اُسے خط لکھا۔ نیلوفر نے جواب میں لکھا: ''صنوبر باجی، بھابی جان ٹھیک کہتی تھیں۔ جس کا شوہر اُسے نہیں پوچھتا، دُنیا میں کوئی اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ شوہر میں

چاہے دُنیا بھر کے عیب ہوں اُسے سات خون معاف ہیں...وہ شوہر ہے اس لیے اُسے بیوی پر ظلم کرنے کا حق ہے...طلاق شدہ عورت کے لیے ہمارے معاشرہ میں کوئی مقام نہیں ہے... اُسے معتوب کیا جاتا ہے، اُس پر شک کیا جاتا ہے، اُسے کمتر سمجھا جاتا ہے...آخر کیوں؟ صنوبر باجی! بتایئے تو میرا گھر کہاں ہے؟ جب شادی نہیں ہوئی تھی تب ہمیشہ سنتی تھی کہ تم تو اس گھر میں مہمان ہو۔ ایک دِن تمھیں اپنے گھر جانا ہے۔ میرے شوہر ہمیشہ کہتے ہیں...'یہ گھر میرا ہے۔ میری مرضی ہوگی تو رکھوں گا ورنہ نکال باہر کروں گا...' بھابی کے گھر پناہ لینے گئی تو وہ کہتی ہیں کہ 'وہی اب تمھارا گھر ہے...''

''صنوبر بی بی! کن خیالوں میں گم ہوگئی ہو۔ بہن بہت یاد آرہی ہے۔'' بھابی جان نے ٹوکا تو میں ساڑی سنبھال کر کھڑی ہوگئی اور کہا: ''بھابی جان، مہربانی کر کے میرے ایک سوال کا جواب دیجیے...نیلوفر نے آخر اس کے شوہر کے پاس لوٹنے کا فیصلہ آخر کیوں کیا؟''

''میں نہیں جانتی صنوبر۔ تمھارے گھر سے لوٹ کر آئی تو مجھ سے بات تک نہیں کی۔ بس اپنے بھیّا کو لے کر چلی گئی۔'' بھابی نے صفائی دی۔ میں خاموشی سے باہر نکل آئی۔

نیلوفر کو گئے چار مہینے ہوگئے تھے کہ ایک دِن اُس کی موت کی خبر ہمیں ملی۔ ہم وہاں پہنچے تب تک کفن دفن بھی ہو چکا تھا۔ نیلوفر کے پڑوس میں ایک ڈاکٹر تھے۔ اُنھوں نے بھیّا کو بس اتنا بتایا کہ وہ ایک حادثہ تھا۔ رات کو نشے میں دُھت شوہر نے نیلوفر کو دھکیل دیا تھا اور خود جا کر پلنگ پر پسر گیا۔ نیلوفر کی خبر بھی نہیں لی۔ دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا کر وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہوگئی، پھر خون زیادہ بہہ جانے سے اُس کی موت ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے بتایا کہ نیلوفر ماں بننے والی تھی۔

آہ! میرے کلیجے میں ہوک اُٹھی! میری پیاری بہن کیا قسمت لے کر آئی تھی...زندگی میں ذرا بھی سکھ نہ ملا اُسے۔ میں نے ساڑی اُٹھا کر کلیجہ سے لگالی اور اُسی وقت وہ خط ساڑی کی تہوں سے نکل کر گر پڑا۔ ایک اِن لینڈ خط جس پر میرا نام و پتہ لکھا تھا، میں جلدی جلدی پورا پڑھ گئی...کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوسری مرتبہ پڑھا...میرا سر گھومنے لگا...تیسری مرتبہ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھا...میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹتا چلا گیا۔

وہ بھابی جان کا خط تھا میرے نام... پانچ مہینے پہلے کا...جب نیلوفر میرے پاس تھی اور میں نے بھابی کو لکھا تھا کہ گاہے گاہے اُسے تسلی دیتی رہیں۔ میرے خط کے جواب میں بھابی

نے لکھا تھا — ''صنوبر بی بی! تم نے اپنے بھیّا کی خیریت پوچھی ہے۔ وہ آٹھ روز سے گھر سے باہر ہیں...نیلوفر کے شوہر سے بات کرنے گئے ہیں... یا تو اُس کے جنازے کو کندھا دے رہے ہوں گے یا کفن دفن کا انتظام کر رہے ہوں گے...ہم لوگ یہاں اکیلے پڑے سڑ رہے ہیں۔ نیا گھر ہے۔ آس پاس والوں سے پہچان بھی نہیں ہوئی ہے اور تمھارے بھیّا بہن کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہماری قسمت میں سکھ سے جینا نہیں لکھا ہے۔ جب سے شادی ہوئی تب سے نند کا بوجھ اُٹھایا۔ اپنے کو کنگال کر اُس کی شادی کی تو مہارانی شوہر کو چھوڑ کر مائیکے آ بیٹھیں۔ ہم اپنے بچّوں کا کریں یا اُس کا پیٹ بھریں۔ پھر ایسی عورتوں کا کیا بھروسہ؟ آج ایک کو چھوڑا، کل دوسرے سے شادی کر دی تو اُسے بھی نہیں چھوڑ دیں گی اس کا ذمہ کون لے؟''

''اُف!'' میرے ہاتھوں سے خط چھوٹ پڑا۔ میں نے سر تھام لیا...تو یہ خط بنا نیلوفر کی موت کا سبب! میرے نام لکھا گیا بھابی کا خط اُس کے ہاتھ پڑ گیا۔ اُس نے پڑھ کر چھپا لیا اور شوہر کے گھر چلی گئی... جہاں اُسے ملی موت!

میں نے اُسی وقت اُٹھ کر اپنا سامان باندھ لیا اور عثمان کا انتظار کرنے لگی۔ اُن کے آتے ہی ہم نکلنے کو تیار ہو گئے۔ بھابی جان حیرت سے بولیں: ''بی بی ابھی ابھی تو کل جانے کی بات ہوئی تھی۔''

میں نے کہا: ''ہاں ہوئی تھی مگر تب مجھے نیلوفر کا یہ پیغام نہیں ملا تھا کہ بھابی جان سے بچ کر رہنا۔ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔''

''کیا کہہ رہی ہو بی بی تم!'' بھابی جان غصّے سے لال ہو کر بولیں۔

میں نے وہ خط انھیں دِکھاتے ہوئے کہا: ''آپ کا یہ زہر بجھا خط مجھ تک پہنچا ہی نہیں۔ نیلوفر نے پڑھا اور خاموشی سے موت کے منہ میں یعنی شوہر کے گھر چلی گئی۔''

بھابی نے ایک لمحہ کے لیے خط پر نظریں ڈالیں...کہا: ''رُک جاؤ صنوبر! مجھے سمجھنے دو...یہ کیا ہو گیا آخر!''

''مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا ہے۔ اب رُک کر کیا کروں گی؟'' کہتے کہتے میں نے عثمان کے پیچھے قدم بڑھا دیے... بھابی جان پشیمان کھڑی رہ گئیں۔

○○

گُل چاندنی کا منڈوا

خیر سے اکبری بیگم کی بٹیا کی شادی ہونے والی تھی۔ محلّے بھر میں آٹھ روز پہلے سے چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے خرچ کر رہی تھیں بیگم۔

دستگیر نانا نے اپنی ساری جاگیر، دھن دولت، عیش وعشرت میں اُڑا دی تھی۔ وہ تو گھر پھونک کر سڑک پر آگئے ہوتے، اگر اکبری بیگم نے اپنے اکبری جلال سے کام لے کر ان سے مورچہ نہ لیا ہوتا۔

دستگیر نانا، جو اپنے سفید بالوں کی وجہ سے جوانی ہی میں نانا کہلانے لگے تھے، عیش کی زندگی کے رسیا تھے۔ جب وہ اپنی تمام دولت اس شوق کی نذر کر چکے تو بیگم کے زیورات پر ان کی نظر گئی۔ ساتھ ہی اُنھوں نے حویلی رہن رکھنے کی سازش شروع کر دی۔ بیگم کے کانوں میں بھنک پڑی تو وہ خاموش نہ رہ سکیں۔ قاصد بھیج کر فوراً اپنے بھائیوں کو بلا لیا۔

اپنے بھائیوں کے سامنے اکبری بیگم نے جب اپنے خاوند کی کرتوتیں بیان کیں تو وہ آگ بگولا ہو اُٹھے۔ اب پانچ گبرو جوان سالے ایک طرف اور دستگیر نانا دوسری طرف۔ کھڑے کھڑے وکیل کی طلبی ہوئی، کاغذات تیّار ہوئے اور حویلی اکبری بیگم کے نام کر دی گئی۔ پھر پانچوں بھائی بہن کو ذرا بھی نہ گھبرانے کا کہہ کر چل دیئے۔

اس طرح حویلی کے معاملے میں ہی بیگم نے میاں کو انگوٹھا نہیں دِکھایا، بلکہ اپنے کھرے سونے کے ٹھوس زیور بھی ایسے غائب کیے کہ دستگیر نانا سر پٹکتے رہ گئے، لیکن رتّی بھر سونا بیگم سے نہ ہتھیا سکے۔

بٹیا کی شادی میں یہی زیور کام آئے۔ آدھے بیچے گئے اور آدھوں کو تڑوا کر نئے فیشن

کے زیور بنوائے گئے۔ کون سی سات آٹھ لڑکیاں تھیں بیگم کی۔ لے دے کر ایک بٹیا تھی، جس کی شادی میں وہ سارے ارمان نکال رہی تھیں۔

اکبری بیگم صرف دستگیر نانا کے لیے لوہے کا چنا تھیں، محلّے والوں میں وہ رانی مکھی کی طرح مقبول تھیں۔ پڑوسنیں ان کے بلاوے پر تار کی مانند کھنچ کر پہنچتی تھیں۔

بٹیا کی شادی میں ٹھیک نو دن پہلے منڈوا پڑا۔ منڈوے کے کھانے میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آدھا محلّہ روزانہ شریک رہتا تھا۔ دوپہر کو لڑکیاں بالیاں باورچی خانے کے کاموں سے فراغت پاکر بیگم کے یہاں پہنچ جاتیں، جہاں بٹیا کے جہیز کے جوڑے سلتے، چادریں، میز پوش کاڑھے جاتے، سِویاں، بڑیاں بنائی جاتیں۔

ایسے وقت میں حبیبہ کی آمد جیسے گلستان میں بہار کی آمد ثابت ہوئی۔

بڑی خالہ نے اس روز دالان میں پہنچ کر نقاب اُتارتے اُتارتے کہا: ''پتا ہے بیگم! مرزا صاحب کے مکان میں نئے کرایہ دار آئے ہیں۔ اُردو اسکول کے جناب ہیں۔''

بڑی خالہ محلّے کا چلتا پھرتا اخبار تھیں۔ ان کی خبریں صد فیصد درست ہوتی تھیں۔ اکبری بیگم نے پان کا بیڑا اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''تو ساتھ ہی کیوں نہ لیتی آئیں اُنھیں؟''

بڑی خالہ پلٹنا چاہتی تھیں کہ اکبری بیگم نے اُنھیں رُکنے کا اشارہ کر کے نصیبن بوا سے کہا، ''بوا، مرزا صاحب کے مکان میں جو نئے کرایے دار آئے ہیں، جا کر ان کی بیگم سے ہمارا اسلام عرض کر کے کہو کہ بٹیا کی شادی انشاء اللہ اگلے جمعہ کو انجام پائے گی۔ بٹیا کو دُعا دینے آئیے۔ مرزا صاحب کی بیگم کی خیریت بھی پوچھتی آنا۔''

نصیبن بوا لوٹ کر آئیں تو اُن کے ساتھ آٹھ نو برس کی خوبصورت گڑیا سی لڑکی تھی۔ ساٹن کا غرارہ کُرتا، سنہری کرنوں والا دوپٹہ، گورے گورے گول مکھڑے پر دوپٹے کی کرنیں یوں جھلملا رہی تھیں کہ چہرے پر نظر نہ ٹکتی تھی۔

اکبری بیگم کو سلام کر کے اُس نے ادب سے کہا: ''ہماری امّی کی طبیعت ذرا ناساز ہے۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں ہمیں بھیجا ہے۔ ہم لوگ سلطان پور سے آئے ہیں۔ ہمارے ابا جان اب بڑے جناب جی بن گئے ہیں۔''

''آپ لوگ کتنے بھائی بہن ہیں؟'' بیگم نے سوال کیا، ساتھ ہی اسے قریب آ کر بیٹھنے کا

اشارہ کیا۔

وہ بیگم کے نزدیک پہنچ کر بولی: ''یہ تو ہم نہیں جانتے، لیکن ہمارے امّی ابا کے ہم دو بچّے ہیں۔ ہماری باجی سسرال میں رہتی ہیں۔''

آس پاس بیٹھی سب بیبیاں کھلا کر ہنس پڑیں تو وہ سب کا منہ تکنے لگی۔ پھر ناگواری سے احتجاج کیا: ''ہم نے کچھ غلط کہہ دیا، بیگم صاحبہ!''

بیگم اپنی ہنسی روک کر بولیں: ''نہیں بیٹی!''

وہ سرعت سے اُن کی بات کاٹ کر بولی: ''حبیبہ خانم ہے ہمارا نام۔''

بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''حبیبہ خانم، آپ نے کچھ غلط نہیں کہا۔ یہ بیبیاں یوں ہی ہنستی ہیں۔ ہمیں یہ بتائیے، آپ اسکول نہیں جاتیں؟''

''ہم چوتھی جماعت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ابا جان جناب جی ہیں نا۔ انھوں نے گھر میں پڑھا کر ہم سے امتحان دلوایا ہے۔ قرآن پاک کا تو ہمارا تیسرا دَور ہے۔'' حبیبہ نے نہایت فخر سے کہا۔

بڑی خالہ جو سویوں کا آٹا گوندھ رہی تھیں، چٹ پٹ حبیبہ کی بلائیں لے کر بولیں: ''چشم بددور! میں قربان جاؤں۔ بڑی پیاری بچّی ہو۔ اچھا بیٹی، یہ بتاؤ تم کس کام میں ہاتھ بٹاؤ گی؟ بڑیاں توڑو گی یا گوٹا ٹانکو گی؟ کشیدہ کاری تو تمھیں آتی نہ ہوگی۔ ایسا کرو، وہ اُدھر لڑکیاں دوپٹوں پر سلمٰی ستارے ٹانک رہی ہیں، وہاں چلی جاؤ۔''

حبیبہ، جس سمت بڑی خالہ نے اشارہ کیا تھا، اُدھر دیکھ کر ذرا شوخی سے بولی: ''اجی نانی، آتی تو ہمیں کشیدہ کاری بھی ہے اور سلائی کٹائی بھی۔ بڑیاں، سویاں بھی ہم خوب بنا لیتے ہیں۔ لیکن شادی کے اس گھر میں بے حد خاموشی ہے۔ ہم کوئی گیت ویت کیوں نہ گائیں؟''

اس کی نظر دیوار پر ٹنگی ڈھولک پر تھی۔ امیرن کا پورا گھر جمال پور گیا ہوا تھا، اس لیے یہاں اب تک ڈھولک کی تھاپ گونجی نہ تھی۔ کوئی کچھ کہتا اس سے پہلے حبیبہ لپک کر ڈھولک اُتار لائی۔ ڈھولک پر پہلی تھاپ پڑتے ہی لڑکیاں اس طرح دالان میں دوڑی دوڑی چلی آئیں جیسے شمع جلتے ہی پروانے لپک آتے ہیں۔

حبیبہ نے بے خوفی سے بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: ''نانی جان!'' (وہ اکبری

بیگم کے شفقت آمیز برتاؤ سے اُن کے رعب داب کو بالکل فراموش کر گئی تھی) ''ہم آپ کو وہی گیت سناتے ہیں جو ہم نے اپنی شادی میں گایا تھا۔''

''تیری شادی! کیا کہہ رہی ہے لڑکی؟'' بیگم بھی آپ سے تو پر اُتر آئیں۔ خواتین حواس باختہ اس کا منہ تک رہی تھیں۔

''ہاں جی، ہم نے اپنی شادی میں سچ مچ یہی گیت گایا تھا۔ اجی نانی جان، کیا بتائیں آپ کو کہ ہماری شادی میں کیسا مزہ آیا تھا۔ ہمارے ابا بنے تھے ہمارے دولہا اور ہماری امّی بنی تھیں ہماری دلہن اور ہم نے ڈھولک پر گایا تھا:

گُل چاندنی کا منڈوا
چنبیلی کی بیل ہے
جی! چنبیلی کی بیل ہے

اور ہمارے ابا سہرے کی لڑیاں ہٹا کر ہمیں شاباشی دیتے۔ ہم خوشی سے پھول کر اور زور زور سے گاتے:

بنا ہے شہزادہ میرا
بنّی جوہی کی بیل ہے
گل چاندنی کا منڈوا
چنبیلی کی بیل ہے۔''

بیبیاں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ حبیبہ اسے اپنی تعریف سمجھ کر اِترائی اور بولی: ''ہماری امّی تو بیچاری محضر میں چھپی بیٹھی تھیں۔ ہم ان سے شرارت کرتے۔ ان سے کہتے:

ہم ساتھ ہیں تمھارے
یہ قسمت کا کھیل ہے
جی قدرت کا کھیل ہے
گُل چاندنی کا منڈوا
چنبیلی کی بیل ہے۔''

اکبری بیگم کسی طرح اپنی ہنسی پر قابو پا کر بولیں: ''شیطان لڑکی! تجھے کس نے بتایا کہ تیری

شادی ہوئی تھی اور اس شادی میں تیرے ابا، امّی تیرے دولہا، دلہن بنے تھے؟"

"بتا تا کون؟" وہ بدستور ڈھولک پر تھاپ دیتی ہوئے بولی۔ "کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ہر شادی میں ایک دولہا ہوتا ہے ایک دلہن ــــ ہماری شادی میں بھی ایسا نہ ہوتا تو ہم امی، ابا کے ساتھ کیسے رہتے ہوتے؟"

ذرا سی دیر میں حبیبہ کی یہ ادا سارے محلّے میں پھیل گئی۔ حبیبہ کا گیت گاتے گاتے گلا دُکھ گیا، مگر لڑکیاں تو لڑکیاں، بڑی بوڑھیاں بھی اصرار کر کے اس سے وہی گیت سنے جاتیں۔ حبیبہ بھی خوشی سے پھول کر دہرائے جاتی۔ "اجی! کچھ نہ پوچھو کیسا مزا آیا تھا ہماری شادی میں۔ ہمارے ابا بنے تھے دولہا اور ہماری امّی بنی تھیں ہماری دلہن۔ ہم نے ڈھولک بجا کر گایا تھا:

گُل چاندنی کا منڈوا
چنبیلی کی بیل۔"

شادیوں میں دولہا، دلہن کی موجودگی اور ڈومنیوں، میراثیوں کے گیت دیکھ سن کر اپنی معصوم سمجھ سے حبیبہ نے شادی کا جو تصوّر کیا تھا، جو تصویر بنائی تھی اس کے پس منظر میں شوخی سے کھلکھلاتی، چہچہاتی حبیبہ، اکبری بیگم پر جادو کی چھڑی گھما گئی۔ اسی لمحے انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس گڑیا کو اچھن کی دلہن بنائیں گی۔ بٹیا کے نکاح سے دو دن پہلے انھوں نے حبیبہ کے پان کر کے ہی دم لیا۔

میں بھی ان لڑکیوں میں شامل تھی جنھوں نے حبیبہ کے ننھے ننھے ہاتھوں میں مہندی رچائی تھی، اسے مخمل کے بھاری کامدار جوڑے میں گٹھری بنا کر بٹھایا تھا، اسے چھیڑا تھا کہ آج کیوں منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی ہو؟ کیوں نہیں وہ گیت گاتیں؟ حبیبہ نے تو نہیں گایا، ہم لڑکیوں نے ہی اسے گدگدا کر گایا تھا،

گُل چاندنی کا منڈوا
چنبیلی کی بیل ہے
بنّی حبیبہ گڑیا جیسی
بنا گیندے کا پھول ہے
جی چنبیلی کی بیل ہے

یہ تصویر کا پہلا اور روشن پہلو تھا جو میں نے آپ کو دِکھایا۔ آج اس واقعے کو گزرے کئی سال بیت چکے ہیں۔ حبیبہ پھر میرے سامنے ہے، مگر قطعی مختلف حالت میں۔ ایک دردناک کہانی کے ساتھ۔

کہانی پر یاد آیا، دستگیر نانا شام کے وقت میاں جانی ماموں کے دالان میں بیٹھ کر ہم بچّوں کو اکثر کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کہانی کچھ اس طرح تھی:

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے اس کا امتحان لیا۔ پہلے اس کے شہزادے، شہزادیاں ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہوئے۔ پھر سلطنت چھن گئی۔ وہ دُور دُور بھٹکنے لگا۔ اسی پر بس نہیں ہوا۔ اسے ایک خطرناک مرض نے گھیر لیا۔ وہ درد سے کراہتا جاتا اور کہتا جاتا۔ ”اللہ تیرا شکر ہے۔ تو چاہے جیسا رکھ...“

کہانی سن کر بچّے یا تو غمزدہ ہو جاتے یا فرطِ حیرت سے خاموشی اختیار کر لیتے۔ یا دل ہی دل میں سوالات سوچتے رہ جاتے۔ مگر میں نانا پر سوالات کی بوچھار کر دیتی، ایسا کیوں نہیں ہوا؟ ویسا کیوں نہیں ہوا؟

حبیبہ کی کہانی ختم ہوتے ہوتے بھی میں نے سوالات کی جھڑی لگا دی۔ تم نے گھر کیوں چھوڑا؟ کیوں کرنے دی اسے دوسری شادی؟ وہ تمھیں مارتا تھا تو تم نے کیوں اس کے ہاتھ نہ توڑ دیئے؟ اپنے ابا کے پاس کیوں نہ گئیں؟ اس نئے شہر میں کیوں آئیں؟“

ہمارے سماج میں جتنی بُرائیاں ہو سکتی ہیں، حبیبہ ان سب بُرائیوں کا شکار ہوئی تھی۔ ناخواندگی، بچپن کی شادی، کم عمری میں ممتا کا بوجھ، سوتن کا دُکھ اور آخر میں طلاق۔ پھر بھی دستگیر نانا کی کہانی کے صابر بادشاہ کی طرح کہتی ہے: ”یہ سب میری تقدیر میں لکھا تھا تو کیا کر سکتی تھی؟ اب بھی کیا کر سکتی ہوں؟ بولو تو۔“

نہیں شاید آپ پوری کہانی سنے بغیر حبیبہ کی نازک حالت سے واقف نہ ہو سکیں گے۔ بات وہیں سے شروع کرنی ہوگی جہاں سے چھوڑی تھی یعنی حبیبہ کی منگنی کے بعد سے۔ ہر چند کہ کہانی اس کے بعد کی مختصر ہے، مگر اس کی زندگی کا فیصلہ کُن موڑ کہانی کے اسی حصّے میں آیا۔

حبیبہ نے ہرا دوپٹّہ پہنا ہی تھا کہ اکبری بیگم نے شادیانے بجوا دیئے۔ ان کا بیٹا ایک ہی تھا۔ بہولانے کے بڑے ارمان تھے۔ حبیبہ اس وقت صرف تیرہ سال کی تھی۔ اکبری بیگم کے چاؤ

نے نہ صرف شادی میں عجلت کی، بلکہ سات سال کے عرصے میں جیبیہ سے چار بچے بھی پیدا کروائے۔ جیبیہ کے کھانے کھیلنے کے دن، بچوں کو جنم دینے اوران کی پرورش میں گزرنے لگے۔

دستگیر نانا بیٹے کی شادی کے بعد ہی چل بسے تھے۔ اکبری بیگم بھی چوتھے پوتے کا منہ دیکھ کرایک دن چپ چاپ چل بسیں۔ اچھّن کے سر پر بزرگ نہ رہے تو ہاتھ پاؤں نکالنے لگا۔ اکبری بیگم نے اس کی نکیل کبھی بہو کے ہاتھ میں نہ دی تھی۔ ماں کا خوف نہ رہا تو بِنا نکیل کا بیل بن گیا۔

اکبری بیگم نے دستگیر نانا کی زیادتیوں سے بچنے کے لیے خود تو قلعہ بندی کرلی تھی، مگر جیبیہ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مدد کوان کے پانچ کڑیل جوان بھائی آئے تھے، تب دستگیر نانا چاروں خانے چت ہوئے تھے۔ جیبیہ کا تو ایک بھی بھائی نہ تھا۔ والد تھے ضرور، مگر کچھ نہ کر سکے۔ مجبور تھے۔ طویل عرصے سے بسترِ علالت پر پڑے تھے۔

اکبری بیگم کے سلوک کا میں نے تجزیہ کیا تو ان ہی کو قصوروار پایا۔ دستگیر نانا کے لچھّن کیا انھیں خبردار کرنے کو کافی نہ تھے۔ اچھّن خون تو نانا ہی کا تھا۔ اپنے زورِ بازو سے کمائی ہوئی دولت ہو تو خرچ کرنے میں دِل دُکھے بھی۔ باپ، دادا کی کمائی پر عیش کرنے والوں کو بھکتے دیر لگتی ہے نہ بگڑتے۔ اکبری بیگم نے جس لاڈ پیار کے ساتھ اچھّن کی پرورش کی تھی، اُس میں اچھّن کا بگڑنا عین ممکنات میں سے تھا۔ پھر اکبری بیگم کوئی حضرت خضر کی عمر تو نہیں لکھا کرلائی تھی کہ آگے کی سوچ کر مطمئن اور پرسکون بیٹھی رہتیں کہ جیبیہ کے مستقبل کے لیے وقت آنے پر کچھ کر جائیں گی مگر ہوا یہ کہ موت، کی آہٹ انھیں سنائی بھی نہ دی اور وہ چپ چاپ چل دیں۔

''آپا'' جیبیہ نے زاروقطار روتے ہوئے کہا۔ ''اماں کے جانے کے چھ ماہ بعد ہی انھوں نے دوسرا نکاح کرلیا۔ میں کچھ بھی تو نہیں بولی۔''

''یہی تو غلطی کی تم نے۔'' میں نے ٹوک کر کہا۔ ''اسی وقت تم کو اچھّن کو روکنا چاہیے تھا۔''

''میں کیوں روکتی؟ وہ میری سنتے کب تھے؟ جاہل، گنوار، بڑھیا کہہ کر مجھے مارتے پیٹتے تھے۔''

جاہل تو خیر وہ تھی، مگر جیبیہ کو گنوار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ رہی بڑھیا ہونے کی بات تو تیرہ برس کی عمر میں بیاہی جا کر بائیس برس کی ہونے تک چار بچوں کی ماں بن جانے پر عورت بوڑھی نہیں ہو جائے گی تو اور کیا ہوگی؟ مگر کمسنی میں ضعیف ہو جانے کی ذمہ دار جیبیہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔

''ابا کی علالت طویل ہوتی جارہی تھی۔ بڑی باجی امی اور اور ابا کو اپنے گھر لے گئی تھیں... میرا میکہ بھی مجھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لیے سوت اور شوہر کی بے اعتنائی برداشت کرتی رہی۔ پھر بھی ایک دن انھوں نے مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے دی اور بچوں سمیت گھر سے باہر نکال دیا۔'' حبیبہ رورہی تھی اور اس کے معصوم بچے اس کا منہ تک رہے تھے۔

''مگر تم یہاں کیسے آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بچوں کو لے کر ٹرین میں بیٹھ گئی۔ کہاں جاؤں گی، یہ سوچا نہیں تھا۔ ٹرین میں ایک بی بی مل گئیں، میری بپتا سن کر بولیں: میرے ساتھ چلو، میرے گھر کا کام کردیا کرنا۔ رہنے کو کمرہ وغیرہ بھی دینے کا وعدہ کیا تھا انھوں نے۔''

اسٹیشن پر حبیبہ کو دیکھ کر میں نے پکار نہ لیا ہوتا تو حبیبہ اس عورت کے ساتھ چلی گئی ہوتی۔ نادان عورت! دُنیا دیکھی نہیں اس نے۔ نہ جانے کون تھی وہ؟ کہاں لے جاتی اُسے؟ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکی ہوتی شاید۔

''حبیبہ اُٹھو،'' میں نے کہا۔ ''سفر سے آئی ہو۔ بچوں کے ہاتھ منہ دُھلا کر انھیں کچھ کھلاؤ پھر سوچیں گے کہ تمھارے لیے کیا کیا جائے۔''

حبیبہ کچن سے ڈبل روٹی اور دودھ لا کر بچوں کو کھلا رہی تھی۔ تین بچے اس کے آس پاس بیٹھے تھے، چوتھا گود میں تھا، جس کے منہ میں وہ نوالے دے رہی تھی۔ مجھے بے اختیار وہ دِن یاد آیا جب ہم نے حبیبہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ نو برس کی کچی کلی، حبیبہ ڈھولک سنبھالے کہہ رہی تھی۔ ''اجی آتا تو ہمیں سب کچھ ہے۔ کشیدہ کاری بھی اور سلائی بھی آتی ہے۔ بڑیاں سویاں بھی ہم خوب بنالیتے ہیں۔ مگر یہاں بڑی خاموشی ہے۔ ہم کوئی گیت ویت کیوں نہ گائیں؟''

''حبیبہ،'' میں اچانک کہہ اُٹھی۔ ''میں اپنے وکیل کو بلاتی ہوں۔ ہم کورٹ میں تمھارے مہر اور بچوں کے گزارے کی رقم کے لیے دعویٰ دائر کریں گے۔''

''نہیں آپا۔ یہ تو گناہ ہے۔ میں برتن مانجھ کر یا مزدوری کر کے اپنے بچوں کی پرورش کرلوں گی، مگر یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ کورٹ، کچہری میرے بس کی نہیں۔'' حبیبہ بُری طرح نروس ہو کر بولی۔

میں نے بھی تیزی سے کہا: ''اب بھی اس طرح بزدلی کا مظاہرہ کروگی تو جس طرح اپنا

مستقبل تباہ کیا ہے، اپنے بچوّں کا بھی مستقبل تاریک کردوگی۔''

''میں نے؟'' وہ پہلے تو ہکاّبکاّ رہ گئی، پھر روہانسی ہوکر بولی: ''میں نے اپنا مستقبل تباہ کیا ہے؟ ایسا کہہ کر ظلم نہ کرو مجھ پر آپا! میں نے تو اپنا آشیانہ بنائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن نہ جانے کیا ہوا...''

''تم بھی سچ کہتی ہو حبیبہ۔ تمھارا وہ آشیانہ گل چاندنی کے کمزور منڈوے کی طرح تھا جو ایک نازک بیل کا بوجھ تو سنبھال سکتا ہے۔ ایک زندگی نہیں سنبھال سکتا۔ اس آشیانے کو تمھاری کم عمری اور ناسمجھی کے باعث دوسروں نے کندھا دے کر کھڑا کیا تھا۔ ایسے منڈوے پائیدار نہیں ہوتے۔ اپنے اندر ہمّت پیدا کرو، اپنے حقوق کے لیے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔ اچھّن کو دِکھا دو کہ تم اس سے کمزور نہیں ہو۔ اگر وہ اپنی مردانگی دِکھانے کو دوسری شادی کر سکتا ہے تو تم بھی چٹاّن بن کر اس کا مقابلہ کر سکتی ہو، بولو تیاّر ہو؟''

حبیبہ کی گود کا بچہّ پیٹ بھر جانے کے بعد نیند غالب آ جانے کی وجہ سے ڈھلک رہا تھا۔ حبیبہ اسے تھپکتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ مجھے وہ حبیبہ یاد آ رہی تھی جو کبھی اپنے گیتوں کے ذریعے سب میں ہنسی بانٹتی تھی۔ افسوس! آج اسی کے پاس اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پی سکے۔

○○

وارث

روز سویرے پودوں کو پانی دینا سروج کے معمولات میں شامل تھا۔ اس دن بھی وہ باغیچہ میں مصروف تھی کہ ایک آٹو آ کر گیٹ پر رُکا۔ اس میں سے اُترنے والے شخص کو پہلے تو وہ پہچان ہی نہیں پائی مگر جب اس شخص نے دیدی کہہ کر اسے پکارا تو وہ خوشی سے بے قابو ہو کر چیخ پڑی۔ ''کمل! یہ تم ہو!''

ماں بھی دوڑی دوڑی آئی۔ اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ واقعی کمل اس کے سامنے کھڑا ہے۔ رہ رہ کر اسے قریب کر لیتی اور دیوانہ وار پیشانی چومنے لگتی۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے محلّے میں خبر پھیل گئی کہ بھاگیہ شری کا بیٹا کمل نو برسوں بعد گھر لوٹ آیا ہے۔ ماں بھگوان کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ سروج نے فوراً مٹھائی منگا کر محلّے میں تقسیم کرائی۔ ماں کی پڑوسنوں نے اسے تسلّی دی ''تم بیٹھ کر بیٹے سے باتیں کرو، جی بھر کر اسے دیکھو۔ کھانا ہم تیار کر کے بھیج دیں گے۔''

سروج کا دل نہ چاہتا تھا ڈیوٹی پر جانے کو۔ مگر اسکول میں ایک اہم تقریب تھی جس میں ضلع کلکٹر کے ساتھ اہم سیاسی شخصیتیں بھی مدعو تھیں اس لیے وہ کسی طرح اسکول سے غیر حاضر نہیں رہ سکتی تھی۔ بے دلی سے تیار ہو کر وہ بیٹھک میں پہنچی۔ کمل کہہ رہا تھا ''میں نے سوچا، پہلے میں تم لوگوں سے مل لوں پھر تمھاری بہو کو بھی لے آؤں گا۔''

''ہائے بھیّا!'' سروج لپک کر آگے بڑھی۔ ''تم نے شادی بھی کر لی، کیسی ہیں میری بھابی؟''

''پانچ سال ہو گئے دیدی! دو بھتیجے بھی ہیں تمھارے۔''

''جاؤنہ کمل...انھیں بھی لے آؤ۔ابھی آج...'' سروج نے طفلانہ ضد کی۔

''نہیں دیدی۔آج نہیں۔وہ ملازمت کرتی ہے اسے چھٹی ملے گی تب لاؤں گا۔تم کہو کیسی ہو؟'' کمل نے پوچھا۔

ماں جھٹ سے بول پڑی ''تیری دیدی ہیڈ مسٹریس بن گئی ہے۔بڑا نام ہے اس کا۔'' سروج نے ماں کو زیادہ بولنے نہیں دیا۔بولی ''میں جارہی ہوں،شام کو جی بھر کر باتیں کریں گے کمل۔''

اسکول کی تقریب میں تمام دن وہ اس طرح مصروف رہی کہ گھر کا خیال نہیں آیا۔ویسے اسکول پہنچتے ہی اسٹاف کو اس نے بھائی کی واپسی کا مژدہ سنادیا تھا اور پارٹی کی حامی بھی بھرلی تھی۔

گھر لوٹتے وقت بڑی مگن تھی سروج۔پتاجی کے گزرنے کے بعد آج پہلی مرتبہ اس نے ماں کو بے پناہ خوش دیکھا تھا۔یوں سروج کی خوشی کے لیے وہ خوش رہنے کی کوشش کرتی تھیں مگر جوان بیٹے کے گھر چھوڑ جانے اور شوہر کی وفات نے انھیں اندر سے توڑ دیا تھا۔سروج نے اگر اپنی زندگی ان کے لیے وقف کردی تھی تو وہ بھی بس سروج کے لیے جی رہی تھیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کمل کی غضبناک آواز سنائی دی۔اس کے بڑھتے قدم رُک گئے۔گویا کمل اتنے برسوں میں ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہوکر گھر کا سکون غارت کردینے کی عادت اُس کی گئی نہیں تھی۔سروج کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔سوچا تھا شام کو اطمینان سے بیٹھ کر کمل کی کہانی سنے گی۔اسے بتائے گی کہ اس کے نادانی میں اٹھائے گئے قدم نے ماں پتاجی کو کتنا دکھ پہنچایا۔کیسے پتاجی اسے یاد کرتے کرتے جہاں سے سدھار گئے۔کس طرح ماں نے رو رو کر اس کی واپسی کی دعائیں مانگی ہیں۔خود اس نے کس طرح ہر دُعا میں اس کی سلامتی کی دُعا کو فوقیت دی ہے۔مگر اب وہ یہ سب باتیں کیسے کرے گی؟ غصہ میں یوں ہی آدمی کو بھلے بُرے،صحیح غلط کی پہچان نہیں رہ جاتی پھر کمل تو غصہ میں اندھا ہوجاتا ہے۔اسے ماں کی ناعاقبت اندیشی پر ملال ہوا۔کیا وہ اس بات کو دو دن بعد نہیں بتاسکتی تھی جس کے آج بتادینے کے نتیجہ میں کمل چیخ چلا رہا ہے۔

چہرے پر مسکراہٹ لاکر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔کمل یکا یک خاموش ہوگیا۔سروج

نے ہنس کر کہا 'ہو چکیں ماں بیٹے کی باتیں؟ کمل! دیکھو بھیا، تمھارے آنے سے ماں کے چہرے پر رونق آ گئی ہے۔ اب کبھی ماں کو چھوڑ کر نہ جانا'' پھر وہ ماں سے مخاطب ہوئی ''لاؤ ماں کچھ کھانے کو دو۔ بڑی بھوک لگی ہے۔''

اس کے کھانا کھانے تک کمل ماں سے باتیں کرتا رہا۔ 'منجو موسی کی تینوں بیٹیوں کی شادیاں کہاں ہوئیں؟ اس کے بچپن کا دوست الطاف کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ شادی کر لی اس نے وغیرہ...؟'

ایک لمحہ کے لیے، بس ایک لمحہ کے لیے سروج نے سوچا، کمل نے اپنی دیدی کی شادی کے بارے میں کیوں نہیں دریافت کیا؟ مگر دوسرے ہی لمحہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر وہ کمل کے نزدیک جا بیٹھی۔ ''ہاں تو بھیا! اب بتا اتنے سال کہاں رہا؟ کیا ہماری یاد نہ آئی تجھے؟ کم از کم ماں کا تو خیال کیا ہوتا...''

''دیدی! ماں نے بتایا ہے کہ پتا جی نے مکان تمھارے نام کر دیا ہے؟'' کمل نے اتنے غیر متوقع طور پر سوال جڑ دیا کہ سروج دنگ رہ گئی۔ پھر بگڑ کر بولی ''یہ میرے سوالوں کا جواب ہے؟''

''جواب دے دوں گا۔ اب تو واپس آ گیا ہوں۔ اور ہوں تو اس گھر کا بیٹا۔ اس مکان کا صحیح حقدار! تنہا وارث! کیا اس حقیقت سے انکار کر سکو گی تم؟'' کمل کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تیر تھا جو سروج کو زخمی کرتا جا رہا تھا۔

''نہیں۔'' سروج نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا ''اور نہ ہی اس حقیقت سے تم انکار کر سکو گے کہ یہ مکان اب میرا ہے۔''

''میں جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔'' کمل نے غصہ میں اپنے بال نوچتے ہوئے کہا ''مرتے مرتے بھی پتا جی میرے ساتھ ناانصافی کر گئے۔ ہمیشہ انھوں نے تمھیں مجھ پر ترجیح دی۔ ہر بات میں وہ مجھے تم سے پیچھے نہ رکھتے تو میں گھر چھوڑ کر کیوں جاتا؟ جیسے میں ان کا بیٹا نہیں دشمن تھا۔''

''جن گھروں میں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی ہے کیا وہ سب لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں کمل!'' سروج نے اُداسی سے کہا ''نہیں، وہ اس ناانصافی کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔ پھر تم یہ بھی تو سوچو کہ تم نے کس طرح پتا جی کی خواہشات کو پامال کیا۔ ان کے

خوابوں کو تعبیر نہیں دی، ان کی توقعات پر پورے نہیں اُترے۔''

''مجھے نہیں سننا پرانی باتیں۔'' کمل ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ماں خاموش بیٹھی رہیں۔ ایک لفظ بھی سروج کی حمایت میں نہیں کہا۔ سروج اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ماں کی بے حسی نے اسے دُکھ پہنچایا تھا۔

پتا جی اسے بہت یاد آ رہے تھے۔ کتنا چاہتے تھے وہ اسے۔ کمل سروج سے تین برس چھوٹا تھا۔ سب کی آنکھوں کا تارا۔ اسی لاڈ پیار نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ جتنا وہ غصیل اور بگڑیل، سروج اتنی ہی نرم خو اور فرمانبردار۔ پتا جی ہر موقع پر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ماں کو یہ امتیاز پھوٹی آنکھ نہ بھاتا۔ دن رات نالائق بیٹے کی حمایت میں پتا جی سے لڑتی رہتیں۔ پتا جی نے کبھی ان کے اعتراض پر توجہ نہ دی۔ صاف کہہ دیا کہ ''کمل بیٹا ہے صرف اسی لیے۔ وہ اسے سروج پر ترجیح نہیں دیں گے۔''

دسویں تک پہنچتے پہنچتے کمل غلط صحبت کا شکار ہو گیا۔ پھر ایک رات گھر کی نقدی اور زیورات سمیٹ کر فرار ہو گیا۔ پتا جی کو یہ غم کھا گیا۔ تپِ دق کے مریض بن کر خون تھوک تھوک کر جان دی۔ مرنے سے پہلے مکان سروج کے نام کر دیا تھا۔

ماں سروج کو کوستی کاٹتی تھیں۔ کمل کے گھر سے بھاگنے اور پتا جی کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتی تھیں، سروج نے اپنی خوشیوں کی قربانی دے کر انھیں سنبھال لیا۔ یہاں تک کہ ماں کے لیے اس نے شادی بھی نہیں کی۔

کیلاش اسے پسند تھا مگر وہ شادی کے بعد ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے راضی نہیں تھا۔ پھر سروج کیا کرتی؟ شادی کا خیال ہی اسے چھوڑ دینا پڑا۔ آج بیٹا بیوی بچوں والا ہو کر لوٹ آیا ہے تو اس خوشی میں ماں یہ فراموش کر گئی ہیں کہ بیٹی ابھی بھی کنواری بیٹھی ہے۔ دو تین دنوں ہی میں سروج کو معلوم ہو گیا کہ کمل جانے کے لیے نہیں آیا ہے، اس کی کوئی مستقل ملازمت نہیں ہے۔ اس کی پتنی جو کچھ کماتی ہے اسی سے گھر چلتا ہے۔ کمل سگریٹ اور شراب کے لیے اب بھی غلط طریقوں سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ ایک دن کمل کی غیر موجودگی میں اس نے ماں سے کہا تھا ''اسے پلّو میں باندھ کر ہی نہ رکھو۔ صحیح غلط کی تمیز بھی کراؤ۔ شراب اور سگریٹ سے دُور رہنے کو کہو، مجھے تو آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ تمام رات کھانستا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ

ڈاکٹر کو بھی دکھا دو۔''

ماں نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی تھی کہ وہ میری سنتا کب ہے۔

ان ہی دنوں ایک سہ روزہ سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے سروج کو حیدر آباد جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹی تو گھر بند پڑا تھا۔ پڑوسن چاچی سے معلوم ہوا کہ کمل اسپتال میں داخل ہے۔ ماں اسی کے پاس ہے۔ سروج کے دل میں بھائی کا پیار اُمڈ آیا۔ سیدھی اسپتال پہنچی۔ راستے میں سرخ پھولوں کا ایک گلدستہ خرید لیا۔

اسپتال میں پہلے ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی، وہ اسے لے کر آفس میں آئے۔ بڑے نرم الفاظ میں بولے ''آپ کی ماں تو کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی ہیں۔ آپ سمجھ دار ہیں آپ سے کچھ چھپانا مناسب نہ ہوگا۔ کمل تپ دق کا مریض ہے اور یہ مرض آخری اسٹیج میں داخل ہو چکا ہے۔''

ڈاکٹر نے آگے اور نہ جانے کیا کہا۔ سروج کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اسے کمل کا بے عزّت کرنا اور پتاجی کو گالیاں دینا یاد آنے لگا۔ ماں کی طوطا چشمی اور سرد مہری یاد آنے لگی۔ اپنے خلوص پر سوالیہ نشان لگایا جانا اور اپنی قربانیوں کا رائیگاں جانا یاد آنے لگا۔ آخر اسے یہ سب کیوں برداشت کرنا پڑا؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ صنف نازک سے تعلق رکھتی ہے؟ کیا عورت ہونے کے ناطے اسے ہمیشہ دوسروں کے دیئے ہوئے، دوسروں کے چھوڑے ہوئے حقوق پر ہی گزارا کرنا ہوگا... کب بدلے گی یہ رسم زمانے کی؟

وہ اپنے باغیچے میں لگی منی پلانٹ کی بیلوں سے بلا ناغہ زرد پتے چن کر الگ کر دیتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا تھا ''اتنی باقاعدگی سے یہ سب کرنے میں کیا راز ہے؟'' سروج نے ہنس کر کہا تھا۔ ''زرد اور خراب پتوں کو نکالوں گی نہیں تو نئے پتوں کو جگہ کیسے ملے گی؟''

زندگی بھر اس نے اسی فلسفے کو اپنایا ہے۔ چھوٹے موٹے اختلافات کو بھلا کر، چھوٹی بڑی رنجشوں کو فراموش کر کے زندگی کو حسین بنائے رکھنے کی کوشش کی ہے، مگر اسے کیا ملا؟ بھائی کی نفرت اور ماں کی بے حسی۔ بھائی جو لوٹ کر آیا ہے تو اس احساس کے ساتھ کہ باپ کے ترکے کا اصلی وارث وہی ہے۔ اور ماں اس کی طرفداری کر رہی ہے۔

سروج دل میں ایک پختہ ارادہ کر کے کھڑی ہوگئی۔ وہ اتنی لاچار، اتنی بے بس بھی نہیں

ہے، قدرت نے خود اسے موقع دیا ہے کمل کو کرارا جواب دینے کا۔ وہ ابھی جا کر اس سے کہے گی کہ ’تمھیں شکایت تھی نا کہ پتاجی نے ورثے میں تمھیں کچھ نہیں دیا۔ لو، تمھاری شکایت کا ازالہ ہو گیا ہے۔ سنو کہ پتاجی سے تمھیں ورثے میں ان کا مرض ملا ہے— تپِ دق کا مرض— اب تو شکایت نہیں کرو گے نا—‘

وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ ماں اسے دیکھتے ہی رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر کمل نے آنکھیں کھول دیں— سروج نے آگے بڑھ کر گلدستہ اس کے سرہانے رکھ دیا... بولی... ’’میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے۔‘‘ خیالات اس کے دماغ میں بھنور کی طرح چکرانے لگے۔ اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ کر آئی تھی کہ کیسے کمل کے دس اعتراضات کا جواب ایک ہی دھماکے میں دینا ہے کہ پتاجی سے ان کا مرض اسے مل گیا ہے... جس کے نصیب میں جو ہو گا وہی ملے گا۔

اسے خاموش دیکھ کر کمل نے بڑے لاچار لہجے میں کہا۔ ’’دیدی کیا میرے نصیب میں خوشیاں نہیں ہیں؟ ایک کے بعد ایک روگ جان کو لگا ہی رہتا ہے۔‘‘

سروج کا وجود موم کی طرح پگھلنے لگا۔ کمل کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھوں کے نیچے کالے حلقے بن گئے تھے۔ پھر زندگی سے نا اُمیدی کا وہ لہجہ اسے اندر تک جھنجھوڑ گیا۔ اس نے اپنا جملہ پورا کیا، ’’میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے بھیّا۔ تو جلدی اچھا ہو جائے گا۔ میں ہوں نا... تیری دیدی، تیرے لیے اپنی جان بھی دے دوں گی... ان سرخ پھولوں کی طرح تو بھی مسکرائے گا۔ اور بھیّا تو دل پر کوئی بوجھ نہ رکھ۔ اصل وارث تو تو ہی ہے۔ میں کل ہی وکیل سے مل کر مکان تیرے نام کر دوں گی۔‘‘

○○

اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان

وہ بمبئی سے بہت دور ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہے۔ یہ شہر ضلع کا صدر مقام ہے۔ دو برس پہلے تک یہ صوبے کا سب سے بڑا ضلع تھا۔ انتظامیہ سے پیدا شدہ مسائل کو مدنظر رکھ کر حال ہی میں اسے دو ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نتیجتاً یہ سب سے بڑے سے سب سے چھوٹا ضلع بن گیا ہے۔ تقسیم کے بعد مسائل مقابلتاً زیادہ ہو گئے ہیں مثلاً سرکاری اقامت گاہوں کا مسئلہ۔ رہائشی عمارتیں جب تعمیر ہوں گی تب تعمیر ہوں گی پہلے دفاتر تو بن جائیں۔ گائے کے گوٹھوں، گیراجوں اور عمارتوں کے برآمدوں میں آفس لگ رہے ہیں۔ پھر ہم ہندوستانیوں کی ذہنیت ایسی ہے کہ کام چاہے نہ کریں سہولیات مکمل چاہتے ہیں۔ اپنے گھر میں بھلے ہی سردی گرمی میں ٹھٹھریں یا پسینے میں نہائیں، آفس میں ہیٹر اور کولر نہ ہو تو آسمان سر پر اٹھالیں گے... کام نہ کرنے کا بہانہ بنالیں گے۔

سرکاری اقامت گاہوں کی کمی کے مسئلے کو سابق اقامت گاہوں کو برقرار رکھنے کی اجازت دے کر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی ایک سرکاری ملازم جس مقام سے تبدیل ہو کر آتا ہے وہ نئے شہر میں سرکاری مکان الاٹ ہونے تک سابقہ مکان کو برقرار رکھ سکتا ہے یا فاصلہ زیادہ نہ ہو تو اپنے مستقر سے اپ ڈاؤن کرسکتا ہے۔ اُسے ہیڈ کواٹر میں رہنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا... ندیم بھی آج کل یہی کر رہا ہے۔

اس شہر میں بمبئی جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ بمبئی جیسا ہجوم و گہما گہمی۔ نہ ہجوم کی انیکتا میں ایکتا، بمبئی کا ذکر تو اس نے محض اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کر دیا۔ بڑے شہر کے پس منظر میں بات کرنے سے اپنے شہر کا بھاؤ بڑھتا ہے... مگر ذرا رُکئے۔ اب ایسا بھی نہیں

کہ اس کے شہر میں بمبئی جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ کچھ تو ہے۔ شہر کی زندگی میں چاہے کوئی یکسانیت نہ ہومگر ندیم کا روزمرّہ کا معمول کچھ ویسا ہی لگا بندھا اور بھاگ دوڑ والا ہے جیسا بمبئی عظمیٰ کے رہنے والوں کا ہے۔ علی الصبح جاگ کر تیار ہونا، پھر ڈھائی گھنٹے کی تکلیف دِہ مسافت طے کر کے دوسرے شہر میں پہنچنا۔ آفس اٹینڈ کرنا، بعدازاں بھاگم بھاگ واپسی کی بس پکڑنا جو جب اُس کا جی چاہتا ہے اُسے اس کے شہر واپس پہنچاتی ہے۔ وقت ساڑھے سات کا ہے مگر شاذ ہی وہ صحیح وقت پر پہنچتی ہے۔ دوڑ کے مقابلے میں حصّہ لینے والا پوائنٹ کے قریب پہنچ کر کچھ زیادہ پُر جوش کچھ زیادہ تیز گام ہو جاتا ہے۔ مذکورہ بس کا ڈرائیور شہر کی بتّیاں نظر آتے ہی نسبتاً زیادہ سست ہو جاتا ہے۔ شاید سوچتا ہے پہنچ ہی تو رہے ہیں۔ پانچ منٹ میں پہنچیں یا پچیس منٹ میں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟

بمبئی کے مرکزی علاقوں کے دفتروں میں کام کرنے والوں کو دُور دراز علاقوں اور نزدیکی شہروں سے لانے لے جانے کے لیے ریلوے کا جال بچھا ہوا ہے۔ منٹ منٹ پر دوڑتی بسیں ہیں۔ مہانگر بمبئی دن بدن بڑھتے رہائشی مسئلے کا سدباب کرنے میں بھلے ہی ناکامیاب ہو، آمدورفت کی سہولیات بہم پہنچانے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ مگر جہاں تک اس ضلع کا سوال ہے، حکومت ضلع کو منقسم کر کے ہی اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئی ہے۔ آمدورفت کے ذرائع نہیں کے برابر ہیں۔ ریل کے نقشے میں یہ شہر نہیں آتا۔ بسوں کی تعداد ناکافی ہے۔ سویرے جو دو بسیں جاتی ہیں وہ تعداد سے دُگنی سواریاں لے جاتی ہیں۔ ڈرائیور کی تنبیہ اور کنڈکٹر کے احتجاج پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کی جگہ بھر جانے تک مسافر چڑھتے رہتے ہیں۔ وہ تو جب کنڈکٹر کے تیور خراب ہونے لگتے ہیں تب بس کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

واپسی کا سفر مقابلتاً زیادہ تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ سویرے ڈیوٹی پر جاتے وقت مسافر تازہ دم ہوتے ہیں اس لیے کھڑے کھڑے بھی سفر کر لیتے ہیں مگر تمام دن آفس میں سر کھپانے کے بعد ہر کوئی آرام سے بیٹھ کر سفر کرنا چاہتا ہے۔ تمنّا کا پھل ہر کسی کے ہاتھ تو نہیں لگتا۔ روانگی کے وقت ہشاش بشاش چہروں سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے جاتے واپسی کے سفر میں ذرا ذرا سی بات پر چڑھتے چلاّتے ہیں۔ البتہ جنھیں بیٹھنے کی جگہ مل جاتی ہے وہ آس پاس سے بے خبر ہو کر ایک جھپکی لے لینے میں بے حد تسکین محسوس کرتے ہیں۔

ندیم بھی کبھی آرام سے بیٹھ کر کبھی کھڑے کھڑے سفر کر کے تمام دن کا تھکا ہارا رات گئے گھر پہنچتا ہے۔ پاس پڑوس میں ہو کا پڑ چکا ہوتا ہے۔ بیوی فریدہ مرجانے کی حد تک بور ہوتی ہوئی انتظار میں بیٹھی ہوتی ہے۔ ندیم ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوتا ہے تب تک وہ کھانا گرم کر لیتی ہے۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ کھانا کھاتے اور باتیں کرتے ہیں۔ سامنے ٹی وی چلتا ہوتا ہے مگر اُن کا دھیان ٹی وی پروگرام سے زیادہ ایک دوسرے پر ہوتا ہے۔

''آج تو کچھ نہیں ہوا نا؟ کوئی درخواست تو نہیں آئی؟ فریدہ کے پہلے سوال عموماً یہی ہوتے ہیں۔

بہت بھولی ہے فریدہ! جن تکلیف دِہ حالات سے آج کل وہ گزر رہا ہے اُن میں بہت جلدی نروس ہو جاتی ہے۔ یہ اُس کی نسوانی کمزوری ہے ورنہ عام حالات میں وہ بڑی حوصلہ مند عورت ہے۔ اُس نے ہر مشکل گھڑی میں ندیم کا ساتھ دیا ہے۔ مہاراشٹر کے دور دراز علاقوں میں ندیم کا تبادلہ ہونے پر ندیم کے ضعیف والد کی خدمت اور بچّوں کی تعلیم کے لیے برسوں اس سے دور رہی ہے۔ گھر کی ذمہ داری اُٹھائی ہے۔ تعطیلات میں ندیم کے گھر آنے پر اُس نے اپنی مشکلوں کا رونا کبھی نہیں رویا۔ اُسے ہر طرح سے مطمئن کر کے واپس بھیجتی رہی ہے وہ۔

اوّل تو خود ندیم کی ساکھ ایماندار اور فرض شناس افسر کی ہے دوسرے فریدہ نے شہر کی سماجی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہ کر اپنی علیحدہ شناخت بنالی ہے۔ کسی بھی شخص کی کامیاب زندگی کے لیے اتنا کچھ کافی ہوتا ہے مگر ندیم اور فریدہ کے ضمن میں یہ صفات ان کے لیے زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوئیں۔ ندیم کی حق گوئی اور حق پرستی سے اور فریدہ کی مقبولیت سے حسد کرنے والوں کی تعداد خاصی بڑی ہے۔

فریدہ پر کوئی ناحق انگلی اٹھائے، نکتہ چینی کرے اُسے خطرناک حد تک نگلیٹ کرے، اُس کی کامیابیوں پر رشک کرنے کی بجائے حسد کرے، اس میں نقص تلاش کر کے اُن کی فہرست تیار کرے، اُس کی غلطیوں کی نشاندہی کرے تو وہ حوصلہ ہار دیتی ہے۔ ندیم اسی لیے ہر بات اُسے نہیں بتاتا۔ فریدہ سمجھتی ہے نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے کہ آج کے اس دور میں ایماندار آدمی کی حالت بتّیس دانتوں کے درمیان رہنے والی زبان کی سی ہے ذرا لغزش ہوئی نہیں کہ دانتوں نے زبان کو کاٹا۔

ندیم کے ماتحت اس سے اسی لیے ناراض رہتے ہیں کہ وہ صداقت کا پرچار کرتا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ندیم خود رشوت نہ لے، دوسروں کو لینے سے کیوں روکتا ہے؟ خود ستیہ وادی ہریش چندر بنا رہے، دوسروں پر اخلاقیات کے ضابطے کیوں لادتا ہے؟ غلط کام ہوتے دیکھ نہیں سکتا تو نظریں کیوں نہیں پھیر لیتا؟ بولتا کیوں ہے؟ زبان پر قابو کیوں نہیں رکھتا؟ وہ اپنے کام سے کام رکھے تو کسی کا کچھ نہ بگڑے۔ اُس کے ماتحت پانچ برسوں میں اتنا بن گئے ہیں جتنا وہ چوبیس برسوں کی ملازمت میں نہیں بن پایا۔ اُسے ماتحتوں کی خوشحالی سے حسد نہیں ہے لیکن اُن لوگوں کی بدحالی اُسے دُکھ پہنچاتی ہے جو استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ بس اسی لیے وہ آواز بلند کرتا ہے ورنہ دنیا کو سدھارنے کا ٹھیکہ تھوڑے ہی لیا ہے اُس نے۔

ندیم کے پاس اردلی بھی نہیں ٹکتے کیونکہ دوسرے افسران کی طرح وہ دورے نکال کر زائد آمدنی کے حصول کی سعی نہیں کرتا۔ ظاہر ہے اردلی بھی سوکھا رہ جاتا ہے۔ ندیم ہر ملاقاتی کو راست اپنے پاس بلا لیتا ہے جس سے درمیان میں اردلی کی مٹھی گرم نہیں ہونے پاتی۔ نتیجتاً وہ کسی دوسرے افسر کی ماتحتی میں جانے کو ترجیح دیتا ہے۔

فریدہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی تب ہر لڑکی کی طرح وہ بھی گہنوں کپڑوں کی شوقین تھی۔ جب تب کسی زیور کے لیے مچلنے لگتی۔ نئی ساڑی خریدنے کی ضد کرنے لگتی۔ مارکیٹ جاتی تو ایک ساتھ کئی ساڑیاں خریدنا چاہتی۔ ندیم روکتا تو کہتی۔ ''اتنے بڑے افسر ہیں آپ! کیا میں گہنے کپڑے کو ترس جاؤں؟ دل پہ جبر کروں!''

''دل پہ جبر کرنے کو میں نہیں کہتا۔ خرچ کرو مگر میری حیثیت کے مطابق۔''

''اچھا تو حیثیت کیا ہے جناب کی؟ ذرا مطلع فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں! جس سے اُسی حساب سے خرچ کیا جائے۔'' فریدہ شوخی سے پوچھتی۔

ندیم سنجیدہ ہو کر کہتا ''میں ایک ایماندار افسر ہوں۔ ساڑھے تین ہزار ماہانہ میری تنخواہ ہے۔ چاہوں تو ہر ماہ دس بیس ہزار روپے اوپر سے کما لوں مگر میرے آئین میں اوپری آمدنی حرام ہے۔ تم مجبور کرو گی تو اس راستے پر شاید چل پڑوں مگر حرام کی کمائی کھانے کے بعد اس گھر کی ذمہ داری سے مجھے آزاد کر دینا۔ میرے سر پر دودھاری تلوار ہوگی، ذلت اور رُسوائی کا خوف اور ضمیر کی آواز مجھے ہمیشہ بے چین رکھے گی۔ خود غرض بن جاؤں گا۔ صرف اپنا خیال رکھوں گا۔''

''آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جس شخص کا کام کریں اُس سے لاٹری کا ایک ٹکٹ منگوالیں۔ اُس ٹکٹ پر انعام نکل آئے تو وہ ہمارا۔'' فریدہ نے اپنی عقل کے حساب سے بڑی دُوراندیشی کی بات کی۔ اس وقت اس کا لاٹری پر بڑا ایمان تھا۔ (اب تو خیر نام بھی نہیں لیتی)

''فرّو! رشوت چاہے ایک ہزار کی ہو یا ایک روپے کی۔ ہوگی تو رشوت ہی۔ پھر میں کسی سے ایک روپیہ بھی کیوں مانگوں؟ سرکار مجھے مشاہرہ دیتی ہے۔''

''ایک روپے سے کوئی غریب نہ ہو جائے گا، مگر ایک روپے سے ہماری زندگی بن سکتی ہے۔''

''نہیں فریدہ، روپے کی اتنی بے قدری نہ کرو۔ روپے تجوری میں بند ہوں تب بھی قہر ڈھاتے ہیں۔ اس کی اصل قیمت سے وہی آگاہ ہوتے ہیں جن کو ایک روپیہ بھی محنت کر کے کمانا ہوتا ہے۔ غریب کے ایک روپے کی قیمت بہت بڑی ہوتی ہے فریدہ۔''

بات فریدہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ چندن کے درخت سے سانپ لپٹے رہتے ہیں مگر چندن اُن کا زہریلا اثر قبول نہیں کرتا۔ فریدہ بھی اپنے ماحول کی جھوٹی شان اور دکھاوے سے بے تعلق رہنے کا فن آخر سیکھ ہی گئی تھی۔ ندیم کے نقشِ قدم پر چل کر جو کچھ اور جتنا مل جائے اُسی پر قناعت کرنے لگی تھی۔

سرکاری ملازمتوں میں تبادلے ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی چلتی ہے اُن کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ جہاں وہ چاہتے ہیں اُسی مقام پر ہوتے ہیں۔ جن کی پہنچ نہیں ہوتی وہ کبھی بھی کہیں بھی اُٹھا کر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ ملازمت کے دوران ندیم کو پورے صوبے میں ادھر سے ادھر پھینکا گیا ہے اور اب جبکہ ملازمت سے سبکدوش ہونے میں صرف تین برس باقی رہ گئے ہیں تب بھی کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہا ہے۔ وہ اس 'شہر میں' جو اس کا آبائی وطن ہے مستقلاً آباد ہونا چاہتا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے اپنا ذاتی مکان بنا لینا چاہتا ہے۔ دونوں لڑکیوں کی شادی کی ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد آدمی کی قدر نہیں رہ جاتی۔ کوئی نہیں پوچھتا اُسے۔ اپنی درخواستوں میں بارہا اس نے حکام کی توجہ اس طرف دلائی ہے۔ التجا کی ہے مگر سب رائیگاں گیا۔ گزشتہ مرتبہ تبادلہ بھی کیا گیا تو اس منقسم ضلع میں جہاں روزانہ پانچ گھنٹے کا سفر کر کے ڈیوٹی انجام دینا اُس کا مقدر بن گیا ہے۔

ندیم کا مخالف گروہ اُسے مسائل کے جنگل میں گھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کارِ خیر میں کبھی اُس کے ماتحت رہ چکے دو افسران پیش پیش ہیں۔ ان میں سے ایک کے غیر ذمہ دارانہ رویے کی اُس نے رپورٹ کی تھی جس کی بناء پر اس کی وہ ترقی رُک گئی تھی جس کا کہ ساٹھ ہزار روپے دے کر اُس نے جگاڑ کیا تھا۔ دوسرے کو بڑی تیزی سے بنگلہ، اسکوٹر، فرج فرنیچر خریدتے دیکھ کر ندیم نے آہستہ خرامی کا مشورہ دے کر اتنا ہی کھانے کی تلقین کی تھی جتنا آسانی سے ہضم ہو سکے۔ پیٹ سے اوپر کھانے میں کھایا پیا سب باہر نکل جاتا ہے۔ رشوت ایک حد کے بعد بڑھے ہوئے پیٹ، پھولے ہوئے گالوں، قیمتی کپڑوں اور خرد ماغی سے بزبانِ خود بولنے لگتی ہے۔ ماتحت ندیم کے زرّیں مشورے کی قدر تو کیا کرتا اُلٹا اس سے دشمنی پر کمر بستہ ہو گیا۔ ان دونوں حضرات کے ساتھ ایک اور صاحب بھی جی جان سے اس کے خلاف اس مہم میں شامل ہو گئے تھے۔ آنجناب کے داماد نے اپنے زمانۂ صدر مدرسی میں ڈیڑھ لاکھ روپے کا غبن کیا تھا۔ ندیم نے انکوائری کی تھی اور اُسے قصوروار پایا تھا۔ داماد راجہ کو نہ صرف رقم واپس کرنی پڑی تھی بلکہ چند ماہ کے لیے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی تھی۔

مخالف گروہ اکثر ہی کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑا کرتا۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے ندیم کے پیچھے پڑے رہنے کے سوا انھیں دوسرا کام نہ ہو۔ ندیم کے خلاف صف آرا ہونے، اُس پر الزام تراشی کرنے میں اُنھیں جو تسکین ملتی تھی وہ فرائض کی انجام دہی میں شاید نہیں ملتی تھی۔ اس کے ہیڈ کوارٹر پر نہ رہنے کو سب سے بڑا پوائنٹ بنایا جاتا کہ وہ اپنے فرائض سے کوتاہی کرتا ہے۔ کبھی الزام لگایا جاتا کہ فلاں روز فلاں شہر میں تھا جبکہ آفس میں اُس کی موجودگی دکھائی گئی ہے اور یہ کہ مقامی سیاست میں حصہ لیتا ہے اور یہ کہ سرکار کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ ایک روز تو حد ہی کر دی اس تکڑم نے۔ ندیم چند دوستوں کے ساتھ شد و مد سے کسی نکتے پر بحث کر رہا تھا۔ کسی بات پر اُس نے مراٹھا سردار شواجی کا حوالہ دیا۔ دوسرے روز تمام اخبارات کے صفحہ اوّل پر جلی حرفوں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک سرکاری افسر (ندیم کا نام دیا گیا تھا) نے شواجی مہاراج کی شان میں ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔

فریدہ کے پسینے چھوٹ گئے تھے ان خبروں کو پڑھ کر۔ اس طرح کی باتوں میں تل کا تاڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ نازک رگ پر چوٹ ہمیشہ کارگر ہوتی ہے۔ یہ گُر عام ہو گیا ہے آج کل۔ کسی آبادی

میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا مل جل کر رہنا ناقابلِ برداشت ہوا تو اخبار میں چھپوا دیا کہ مندر میں گائے کا یا مسجد میں سوّر کا گوشت پایا گیا ہے۔ کسی سے پرانا بیر نکالنا ہوا تو درج کرادی رپورٹ تھانے میں کہ فلاں شخص نے ہماری ذات کو لے کر ہم پر حملہ کیا، ہماری توہین کی۔ کسی کی عزّت خاک میں ملانی ہوئی تو لگا دیا الزام کہ اس نے نابالغ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا۔ کسی کی ترقی اور خوشحالی سے حسد ہوا تو اس پر کسی مذہبی رہنما یا تاریخی ہیرو کی شان میں گستاخی کا تیر بہدف نسخہ استعمال کرلیا۔ فیصلہ جب ہوگا تب ہوگا عدالت کے چکّر تو لگوائے جا سکتے ہیں۔

فریدہ کی پریشانی دیکھ، ایک بار تو ندیم بھی ہراساں ہوگیا کہ اس مرتبہ مخالفین نے زبردست وار کیا ہے۔ مگر عقل سے کام لیتے ہوئے ندیم نے سیدھے اپنے افسرِ اعلیٰ سے بات کی۔ مخالف گروہ کی اب تک کی کارروائیوں کے بارے میں بتایا اور مدد کا طالب ہوا۔ افسرِ اعلیٰ نے بھی سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کیا اور دوسرے دن کے اخبارات میں اپنا بیان شائع کرایا کہ 'اُن کے محکمے کے ایک فرض شناس افسر پر شواجی مہارج کی شان میں گستاخی کرنے کا جو بے بنیاد الزام لگایا گیا ہے اُس کے صحیح ثابت نہ ہونے پر اس کے ذمہ دار اشخاص پر سرکار کی طرف سے مقدمہ چلایا جائے گا۔' بیان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ دھواں اُٹھنا ہی شروع ہوا تھا کہ آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔

اس قضیے سے نجات ملی تو ندیم نے اپنے شہر میں تبادلے کے لیے کوششوں کا ازسرِ نو آغاز کیا۔ مقامی لیڈر کو رام کرنے کے لیے اُس کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ روپیہ ہوتا بھی تو کام ہوجانے کی گارنٹی نہیں تھی۔ ایک کو رشوت دے کر کام کرالیتا۔ دوسرے روز مخالف گروہ کا لیڈر اقتدار میں آجاتا تو پھر تبادلہ پھر رشوت پھر اقتدار کی اَدلا بدلی... یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ مگر یہ سب تو تب ہوتا جب ندیم رشوت دینے کے لیے تیار ہوتا۔ رشوت لینا دینا اُس کے اصول کے خلاف تھا۔

برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ تھک کر ندیم نے کوششیں ترک کردیں۔ فریدہ سے کہا "میں اب تبادلے کے لیے سعی نہیں کروں گا۔ ایک پیر کی مریدی اختیار کرلی ہے۔ گھر بیٹھے میرا کام ہوجائے گا۔"

فریدہ کو حیرت ہوئی۔ ندیم پیری مریدی کے چکّر سے ہزاروں میل دور رہتا تھا۔ پھر اس

اہم مسئلے میں وہ ضعیف الاعتقاد کیوں بن گیا؟ کیا نا اُمیدی کی انتہا اُسے اس طرف لے گئی ہے؟ اُس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ ندیم حقیقت سے اُسے واقف کرادے۔ ندیم نے ہنس کر ٹال دیا۔

کوئی تین ماہ بعد فریدہ کے ہاتھوں میں ندیم نے آرڈر لا کر رکھ دیا۔ اس کے اپنے شہر میں تبادلے کا آرڈر۔ ساڑھے تین سال بعد اس کی کوششیں بارآور ہوئی تھیں۔ فریدہ کا سوال کہ یہ کیونکر ممکن ہوا، ندیم نے ہنس کر جواب دیا۔ ''مرشد کا فیض ہے۔''

فریدہ مرعوب ہوگئی۔ ندیم کے مرشد کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتی تھی کہ ندیم نے روک دیا۔ تلخی سے کہا ''کوئی فیصلہ کرنے میں عجلت نہ کرو۔ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ بیٹھے بیٹھے دُعا تعویذ کرانے والا شخص لمحاتی سکون چاہے حاصل کرلے، دائمی سکھ ہرگز نہیں حاصل کرسکتا۔ میں نے تم سے مذاق کیا تھا۔ لو اب اصل بات بتاتا ہوں۔''

ندیم کے دوست نے اس کام میں اس کی مدد کی تھی۔ جمیل ہی کو وہ مرشد کہتا تھا۔ وہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھا اور دفتر کی سیاست کا تجربے کار کھلاڑی بھی تھا۔ اس نے اپنے تجربے کا فیض ندیم کو پہنچایا۔ ندیم کے آفس میں وقفے وقفے سے اُس نے کئی خطوط بھیجے۔ یہ خطوط شہر کے معززین اور ذی حیثیت افراد کی طرف سے تھے۔ ان خطوط میں ندیم کی ایمانداری اور فرض شناسی کی تعریف کرتے ہوئے اُسے مزید تین سالوں کے لیے اسی شہر میں رکھے جانے کی پُرزور سفارشیں تھیں۔ دوسری طرف مقامی ایم ایل اے کے کان بھرے گئے کہ ندیم مستقبل میں ہونے والے انتخابات میں شامل ہونے کی تیاری کررہا ہے اور اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔

''بات یہ ہے فریدہ کہ ہیڈ آفس میں جب خطوط پہنچے تو تبادلے کے فوری احکامات جاری ہوگئے۔ افسران اپنے ماتحتوں کی ہر دلعزیزی قطعی برداشت نہیں کرسکتے۔ ادھر اُن کے کان کھڑے ہوئے، ادھر مقامی لیڈر کو اپنی کرسی خطرے میں نظر آئی۔ اس نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ میں نے پہلے کوئی دس مرتبہ اُن سے سفارش کرنے کے لیے کہا تھا... ہاں ہاں کرکے رہ جاتے تھے۔ آفس میں میری درخواست تھی ہی۔ بڑے صاحب نے آرڈر نکال دیا۔ اوپر سے احسان بھی لاد دیا کہ لو تمھاری خواہش پر تمھارے آبائی شہر میں تبادلہ کررہے ہیں۔ یہ کیسے کہتے کہ تمھاری مقبولیت سے ڈر گئے ہیں۔''

فریدہ نے کہا ''مگر آپ اتنے خوش نہیں ہیں جتنا ہونا چاہیے۔ کیوں؟'' ندیم نے طویل سانس لے کر کہا ''فریدہ، میں تمام زندگی سچائی کے راستے پر چلتا رہا۔ اپنے فرض سے میں نے کبھی کوتاہی نہیں کی مگر دیکھتا ہوں آج میں اُن ہی لوگوں کی صف میں کھڑا ہوں، بے ایمانی اور فریب جن کا شعار ہے۔''

''ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ؟ آپ نے کسی کی حق تلفی نہیں کی۔ کسی کو دُکھ نہیں پہنچایا۔''

ندیم نے کہا کچھ نہیں مگر فریدہ کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کیے وہ سوچ رہا ہے۔ شاید فریدہ ٹھیک کہہ رہی ہے... مگر اُس نے اوروں کو فریب چاہے نہ دیا ہو، خود اپنے آپ سے فریب دہی کا گنہگار رہا ہے۔ غلط کاموں کو صحیح ٹھہرانے کے لیے جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ غلط کاموں کو جاری رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔ تمام زندگی سچائی پر چلنے والے نے اپنی آخری بازی جھوٹ اور فریب سے جیتی ہے، یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔ اگر ایک پلڑے میں اپنے تمام نیک اعمال کو رکھ کر، دوسرے پلڑے میں وہ اپنی اس اکلوتی تقصیر کو رکھے تو کیا توازن برقرار رہے گا؟ میزان کسی اور کے ہاتھ میں ہونے پر نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ وہ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں دوسرے پلڑے کے جھک جانے کے امکانات اُس صورت میں یقیناً زیادہ ہیں جب میزان خود اس کے ہاتھ میں ہو۔

○○

عورت

''بدامی او بدامی ! اٹھ جلدی'' پنچانن نے سڑک پر سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔ مگر بدامی کو ہوش ہوتا تب ہی تو سنتی۔ پنچانن نے ٹھوکر مار کر دروازے کی ٹٹی ہٹائی تب پہلی مرتبہ بدامی کو اُس کی آواز سنائی دی۔ پھٹے بانس کی سی آواز جو شراب کے نشے سے کچھ اور اونچی کچھ اور کرخت ہوگئی تھی۔

بدامی کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے آنکھوں کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ نشے میں دُھت پنچانن ایک ہاتھ میں ایک مرغا اور دوسرے ہاتھ میں شراب کی بوتل لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ بدامی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہونٹ دانتوں میں دبا کر اس نے کسی طرح اپنے غصّے کو قابو میں کیا۔ آنکھیں بند کر لیں، پھر دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔

''بدامی... سالی سن رہی ہے یا نہیں؟ چل اُٹھ کر مرغا پکا۔ سب سامان لایا ہوں۔ بلرام بھی آوے گا۔ دوسری بوتل لانے گیا ہے۔''

بدامی خاموش رہی۔ پنچانن کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔

''ٹھہر سالی بتاتا ہوں تجھے!'' کہہ کر پنچانن نے بوتل ایک طرف رکھ دی۔ دیوار سے ٹوکری اُتار کر مرغا اس کے نیچے بند کیا پھر بڑبڑانے لگا۔ ''سالی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ہاں نہیں تو... ساّلا ایک تو آج کتنے دنوں بعد خیرو بھائی کا مرغا ہاتھ لگا ہے۔ اور ادھر اس حرامزادی کو نخرے سوجھ رہے ہیں۔ یہ پکا کر نہیں دے گی تو مرغا کھانے کیا اس کی سوتن کے گھر جاؤں گا۔ تو اُٹھتی ہے یا نہیں؟''

اس نے بدامی کے نزدیک پہنچ کر اسے ٹھوکر لگائی۔

بدامی اسی طرح پڑی رہی۔ آج حقیقتاً وہ بیمار تھی۔ بخار سے اس کا تمام جسم پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا ورنہ یہ گالی گلوچ اور یہ حیوانی سلوک اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ پنچانن تمام دن آوارہ گردی کرتا۔ شراب خرید نے بھر کی کمائی ہوتی نہیں کہ پیٹ کے جہنم کو دارو سے بھر کر رات گئے گھر لوٹتا۔ پاؤ بھر گوشت یا مچھلی ساتھ لاتا۔ موقع ملنے پر کسی کا مرغا مرغی پار کرنے سے نہ چوکتا۔

بدامی کو اس سے ایک پیسے کا سہارا نہ تھا۔ برخلاف اس کے پنچانن ہی اسے نوچ کھسوٹ کر اس کے چھپائے روپے نکال لے جاتا۔ آج خیرو بھائی کا مرغا چرالایا ہے کمبخت! احسان فراموش ہے نمبر ایک کا! بھیما، بدامی کا بیٹا گزشتہ دنوں لقمۂ اجل ہو جاتا اگر خیرو بھائی نے بروقت مدد نہ کی ہوتی۔ اپنے رکشہ میں ڈال کر انھوں نے بھیما کو اسپتال پہنچایا تھا۔ دوائیں خریدی تھیں اور رات بھر اس کے ساتھ اسپتال میں بیٹھے رہے تھے۔ اس پنچانن کو تو رات کو گھر لوٹنے پر بھیما کی علالت کی خبر ملی تھی۔ وہ اسپتال کی سمت چلا بھی تھا مگر نشے کی زیادتی سے راستے ہی میں لڑھک گیا تھا۔

''بدامی!'' پنچانن نے حلق پھاڑ کر گالی بکی پھر اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بدامی نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آج مجھ سے مت بولو جی۔ میرا جی اچھا نہیں ہے۔ بخار بھی ہے۔''

''کھا کھا کر مُٹا رہی ہے سالی اور کہتی ہے جی اچھا نہیں ہے۔'' پنچانن جھلا کر چلاّیا ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کیا تیری ماں آ کر پکائے گی؟ زیادہ نخرے نہ دکھا، ورنہ مار مار کر بھر کس نکال دوں گا۔''

پنچانن نے ہاتھ پکڑ کر اسے زمین سے آدھا اوپر اٹھا دیا۔ چاروناچار بدامی کو اُٹھ کر کھڑا ہونا پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر اس نے پنچانن کو دیکھا۔ تین برس ہوئے اس شخص سے اس کی شادی ہوئے، تین لمحوں کا بھی سکھ اس نے نہیں پایا۔ روزمرہ کی لڑائی، گالی گلوچ مار پیٹ، اس کی زندگی بن گئی تھی۔

بھیما کی پیدائش سے کچھ دیر پہلے تک اس نے بدامی کو لاتوں گھونسوں سے مارا تھا۔

گوشت پکاتے پکاتے اُٹھ کر وہ فراغت حاصل کرنے میدان گئی تھی اور درد کی ایک تیز لہر اٹھنے پر وہیں ڈھیر ہوگئی تھی۔ ادھر گوشت جل گیا تھا۔ جلنے کی بو پھیلنے پر پنچانن اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ اس کی تکلیف اس کے درد کا احساس تو کجا، گوشت جلا دینے کے جرم کی پاداش میں اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اسی مار پیٹ کے دوران بھیما نے جنم لے لیا تھا۔

''حرامزادی! کیا کھڑی کھڑی مرگئی۔'' پنچانن نے اسے جھنجھوڑا۔

''پرے ہٹ!'' بدامی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پنچانن نشے میں دُھت تھا۔ بدامی کے دھکّے سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھار نکلی۔ بدامی اور بدامی کے ماں باپ اور اس کے سارے خاندان کو گالیاں بکتا ہوا پنچانن کہنیوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

بدامی کا بخار دماغ پر چڑھ گیا۔ وہ ہوش کھو بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ دردِ زہ سے چھٹپٹا رہی تھی۔ پنچانن اسے مار رہا تھا اور بھیما کا جنم ہو رہا تھا۔ وہ مشتعل ہوگئی۔ ایک تیز غرّاہٹ کے ساتھ پنچانن پر پل پڑی۔ لات گھونسے، تھپڑ برسانے لگی۔ پھر بھی اسے تسلّی نہ ہوئی تو شراب کی بوتل اُٹھا کر مسالہ پیسنے کی سل پر پٹخ دی۔ ایک ٹھوکر ٹوکری میں ماری۔ ٹوکری اُلٹ گئی۔ مرغا اس کے نیچے سے نکل کر کھلے دروازے سے باہر بھاگا۔

'آ جا مورے بالما تیرا انتظار ہے... جیا بے قرار ہے'...اچانک دور سے ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا بلرام کی بھونڈی آواز میں یہ گیت بدامی کو سنائی دیا۔ یقیناً وہ بوتل لے کر دعوت کے تصور میں مگن لوٹ رہا تھا۔ لپک کر بدامی نے چراغ بجھا دیا۔ کواڑ کی ٹٹی لگائی اور اس سے پشت ٹیک کر بیٹھ گئی۔ بلرام نے دروازے پر آ کر پنچانن کو متعدد مرتبہ پکارا پھر بکتا جھکتا واپس چلا گیا۔

کتنی ہی دیر تک بدامی، ہر قسم کے احساس سے بے نیاز بیٹھی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس لوٹے تو اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ کیا کر بیٹھی ہے وہ! پنچانن پر ہاتھ اٹھایا ہے! پنچانن ہوش میں آنے پر اسے زندہ چھوڑے گا؟ شرابی ہوا تو کیا ہوا؟ ہے تو مرد! مرد کو اپنی برتری کا ہمیشہ احساس رہتا ہے۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کرے گا کہ کوئی عورت اس پر ہاتھ اُٹھانے کے بعد زندہ رہے۔ اسے مزہ چکھا کر رہے گا وہ۔ کیا کرے اب بدامی! کیا خودکشی کر لے؟ مگر بھیما کا کیا ہوگا؟ بھیما کے لیے اسے ہر حال میں جینا ہوگا۔ اسے اپنے باپو کے پاس لوٹ جانا چاہیے ورنہ ہوش میں آتے ہی پنچانن اس کا گلا دبا دے گا۔

ایک عزم کے ساتھ بدامی اٹھی اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر اس نے اپنے اور بھیما کے کپڑے گٹھری میں باندھے پھر بھیما کو گود میں اٹھانے کے لیے بڑھی ہی تھی کہ ایک نئے خیال نے اس کے قدم روک لیے۔ پنچانن اگر جلد ہی ہوش میں آ گیا اور اس نے اسٹیشن پر آ کر اسے پکڑ لیا تو؟ پسنجر گاڑی جانے میں ابھی دو گھنٹے کی تاخیر ہے۔ تب وہ کیا کرے جس سے پنچانن اس کا تعاقب نہ کرنے پائے۔ گٹھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ خوف کا ایک زبردست حملہ اس پر ہوا۔

شادی کے دو ماہ بعد کا ایک واقعہ ذہن کے کسی گوشے سے رینگ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس روز پنچانن نے اسے اس بُری طرح زدوکوب کیا تھا کہ بدامی نے اسے چھوڑ کر مائیکے جانے کا تہیہ کر لیا ''کمینے کتے! جانور! میں بھر پائی تیرے سے! میں اپنے باپو کے پاس جا رہی ہوں۔'' وہ خون تھوکتی ہوئی نفرت سے بولی تھی۔

''جا کے تو دیکھ! ٹانگیں نہ توڑ دوں تیری! تو نے گھر سے قدم نکالا اور میں نے تیری بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلائیں۔'' پنچانن نے اسے دھمکایا تھا۔

بدامی کہیں سچ مچ اپنے باپو کے پاس چلی نہ جائے اس اندیشے سے پنچانن نے کوئی انتظام کر لینا بہتر سمجھا۔ تین روز تک گھر سے باہر جاتے ہوئے وہ بدامی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں پٹی باندھ جاتا تاکہ نہ وہ بھاگ سکے نہ چیخ کر کسی کو مدد کے لیے بلا سکے۔ بدامی کو ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ پنچانن کے پاؤں پکڑ کر اس نے معافی مانگی تھی تب کہیں جا کر اس کی گلو خلاصی ہوئی تھی۔

وہ بھی آج یہی طریقہ اپنائے گی۔ آج ایک ساتھ تمام حساب صاف کر لے گی... اسی طریقہ سے پنچانن کو اپنے پیچھے آنے سے روکے گی جیسے کبھی اس نے بدامی کو روکا تھا۔ بدامی نے کسی طرح گھسیٹ کر پنچانن کو چارپائی پر ڈالا۔ چارپائی کے ڈنڈوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونسا اور بھیما کو گود میں لے کر اسٹیشن کی طرف دوڑ گئی۔

ٹرین میں بیٹھ جانے کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہوا۔ مگر ذرا دیر کو اس کی آنکھ لگتی کہ پنچانن راکشش کی طرح اس پر چڑھ دوڑتا دکھائی دیتا اور وہ پسینہ پسینہ ہو کر جاگ اُٹھتی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پنچانن جو کچھ ہوا اسے فراموش کر جاتا۔ وہ اس سے بدلہ ضرور لے گا... اس کا بوڑھا

باپو کیا پنچانن سے اس کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو سکے گا... یقیناً ہی نہیں۔ تب وہ گاؤں جا کر کیا کرے گی؟ اس سے غلطی ہوئی۔ اسے پنچانن کو جیتا نہ چھوڑنا چاہیے تھا۔ ایک بار مار ہی ڈالتی تو زندگی بھر کا پاپ کٹ جاتا۔ وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو پنچانن کے خوف کے سائے میں بسر ہو۔

بدامی کے گاؤں کا اسٹیشن آیا اور گزر گیا۔ اس نے کسی انجان مقام پر جا کر رہنے کا طے کرلیا... کوئی ایسا مقام جہاں پنچانن اس تک نہ پہنچ سکے۔ پہلے بھی وہ مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ بھرتی تھی اب بھی محنت مزدوری کر کے زندگی گزار لے گی۔

دو مہینوں تک بدامی اِدھر اُدھر چھپتی پھری۔ پنچانن کا خوف اس کے دل سے جاتا نہ تھا۔ دس پندرہ روز سے زیادہ کہیں ٹکتی نہ تھی کہ مبادا پنچانن اس کا پتہ پالے۔ ایک روز وہ ناگپور کے اسٹیشن پر اتری تو اسے خیال آیا، اس کے کاکا کی ایک لڑکی پاس ہی کے ایک گاؤں میں بیاہی ہے۔ وہ تارا کے گھر پہنچی۔ تارا اور اس کے شوہر اُودھو کو اپنی بیتی سنا کر مدد کی طالب ہوئی۔

ان دونوں نے اس کی ہر ممکن مدد کی۔ اس کے لیے علاحدہ جھونپڑی بنادی۔ تارا کے ساتھ وہ کھیتوں میں کام کرنے لگی... یہاں وہ کافی محفوظ تھی۔ چار ماہ بعد جب پنچانن کا خوف اس کے ذہن سے معدوم ہو گیا تھا... وہ اچانک اس کے سامنے آ پہنچا۔

سانولا سجیلا، داڑھی مونچھ سے بے نیاز چہرہ، گھنے کالے بال تیل سے چپڑے ہوئے۔ صاف دُھلا ہوا کرتا پاجامہ زیب تن کئے ایک جوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پہلے تو بدامی اسے پہچان ہی نہیں پائی پھر اچانک ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا۔ پنچانن! پنچانن ہے یہ!

پنچانن کو گھنی بے ترتیب داڑھی اور میلے چیکٹ لباس میں دیکھنے کی عادی بدامی کو اسے شناخت کرنے میں تامل ہوا تھا مگر تھا وہ پنچانن ہی۔

''تو... تو یہاں کیسے پہنچ گیا؟'' زرد پتے کی طرح کانپتی ہوئی بدامی نے پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بچاؤ... بچاؤ'' کی صدائیں بلند کرتی ہوئی بھاگی۔

''بدامی!... سن بدامی'' پنچانن نے اسے روکنا چاہا مگر جانے پہچانے راستے پر ہرن کی مانند قلانچیں بھرتی ہوئی بدامی نے تارا کے صحن میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ ہانپتی ہوئی وہ اُودھو سے بولی۔ ''وہ آ گیا... بھائی مجھے بچا۔''

تارا کے سنبھالتے سنبھالتے بھی بدامی بے ہوش ہوگئی۔ تب تک پنچانن وہاں پہنچ چکا تھا۔
''تم پنچانن ہو؟ کیوں آئے ہو؟'' چھفا اُدھوڑھال بن کر بدامی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
پنچانن گھگھیا کر بولا ''بدامی کو لینے آیا ہوں۔ دادا... میں نے شراب پینی چھوڑ دی ہے۔ اس دن بدامی نے میرے ساتھ جو کیا اچھا کیا۔ میری آنکھیں کھول دیں اس نے۔ میں شام تک بندھا پڑا رہا۔ جب بلرام نے مجھے دارو کی بھٹی پر نہ پایا تو کھوج کی۔ گھر آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھولے... سارے گاؤں میں اس نے بات پھیلا دی... گاؤں والے بولے ''لات مارو ایسی جورو پر، جو مرد پر ہاتھ اُٹھاتی ہے۔'' بلرام نے بھی کہا۔ ''چلو اُس کو مار کر گاڑ دیتے ہیں، مگر دادا — مجھے بدامی نہیں بھولتی تھی...''

''بدامی یہاں اس گاؤں میں ہے... اس کی خبر تجھے کس نے دی؟'' اودھو نے مشتبہ نظروں سے اسے گھور کر پوچھا۔

پنچانن نے کہا ''میں روز روز جا کر بدامی کے باپو کے پاؤں پڑتا تھا کہ بتاؤ بدامی کہاں جا سکتی ہے؟ باپو جھڑک دیتا تھا مجھے... مگر ایک دن اسے مجھ پر دیا آ ہی گئی — اپنے سب سمبندھیوں کے پتے اس نے مجھے دے دیئے۔ لوہ گاؤں، کنیرا، بھیما گڑھی، بارا ماٹی سب استھان دیکھ آیا ہوں۔'' پنچانن نے اودھو کے پاؤں پکڑ لیے اور روتا ہوا بولا۔ ''تمھارے پاؤں پڑتا ہوں دادا! بدامی کو میرے ساتھ کر دو۔ میں اب بدل گیا ہوں۔ بالکل بدل گیا ہوں۔ سب بُری عادتیں میں نے چھوڑ دی ہیں۔ میں محنت مجوری کروں گا مگر بدامی کو رانی بنا کر رکھوں گا۔''

تارا کی گود میں نیم بے ہوشی کے عالم میں لیٹی بدامی کو، منت سماجت کرتے پنچانن پر بڑی دَیا آئی... ''کیسی چروری کر رہا ہے اُودھو دادا کی... وہ بھی کیسی مورکھ ہے کہ ایسے بھلے مانس کو نہیں پہچان پائی... اپنے کرم خراب کر بیٹھی۔ اس نے پاپ کیا جو پنچانن پر ہاتھ اُٹھایا۔ وہ تو دیوتا آدمی ہے۔''

OO

APNE HATHON MEIN THAMA HUA
MIZAN

(Short Stories)

by

Dr. Bano Sartaj